وفا کا موسم

"پھوپھو کے ہاں بھی کہلوا دو۔ ربیعہ و سمیعہ بھی ساتھ چلیں بڑا مزہ آئے گا۔"

"کیا معلوم پھوپھی جان منع کر دیں۔" رینا نے گلابی دوپٹہ پریس کرتے کرتے کومل پر خدشہ ظاہر کیا۔

"منالیں گی وہ دونوں۔" کومل نے اطمینان ظاہر کیا۔

"کتنی مشکل سے ابو اور چچا جان مانے ہیں۔ مگر دیکھو رمضان کا دم چھلا ساتھ لگا دیا ہے۔ آخر گاؤں میں غفور بھی تو ہے ناں گھر اور زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے۔ کیا باڈی گارڈ انتخاب کئے ہیں ہمارے لئے۔" رینا نے منہ بنایا۔

"جیسے ہم بچے ہیں۔" کومل نے بھی ٹکڑا لگایا۔ "ارے وہ تو لڑکوں کی فوج ظفر موج بھی تیار تھی۔ ہماری نگہبانی کو اور یہ تو کرم ہوا کہ ان کے سمسٹر شروع ہو گئے۔" کومل نے مزید کہا۔

"چھوٹی پھوپھو کے ہاں فون کر کے معلوم کر لینا تھا سیما کی تیاری بھی مکمل ہو گئی یا نہیں۔؟"

"ہما اور ربیعہ تو آجائیں گی شام کو تایا ابا کے ہمراہ۔"

یہ سب ہنگامہ گاؤں جانے کا تھا۔ بس بیٹھے بٹھائے سوجھ گئی تھی کہ اس مرتبہ سب لڑکیاں آبائی گاؤں جا کر تفریح کریں گی پہلے تو بزرگ راضی نہ ہوئے مگر اصرار اس قدر شدید تھا کہ ہتھیار ڈالنا پڑے۔ خان حماد حسین کی بیٹیاں کومل اور سنبل ان کے چھوٹے بھائی کی تینوں لڑکیاں رینا، بینا اور مینا ان کے بڑے بھائی کی لڑکیاں ہما اور ربیعہ دونوں چھوٹی بہنوں۔ محمودہ وسعیدہ کی بیٹیاں بالترتیب سیما اور ربیعہ وسمیعہ دس لڑکیوں کا جلوس تھا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ گھریلو ضروریات کی اہم چیزیں رمضان کی ذمہ داری تھی کہ ان کی علیحدہ پیکنگ ہو۔

حماد حسین کی آفس وین 'معہ آفس ڈرائیور کے انہیں وہیں لے کر جا رہی تھی۔ لڑکیاں کومل کی قیادت میں اپنی دس روزہ آزادی پر خوشی سے نعرے مار رہی تھیں۔ سوائے سیما کے ان میں کوئی لڑکی ایسی نہیں تھی۔ جس پر بزرگ بھروسہ کرتے ہوں۔ باقی تو کی "ذہنی صحت" پر عموماً" دوسرے شک وشبے میں ہی مبتلا رہتے تھے۔

اگلے روز جب دو تانگے گاؤں کی پگڈنڈی عبور کر کے آبادی میں داخل ہوئے تو باہر موجود افراد نے رنگ برنگے شاہکاروں کو حیرت سے دیکھا اس قدر حیرت سے کہ منہ بند کرنا بھول گئے۔

فیقے چمار کی ماں دہی کا برتن سر پر رکھے کھیتوں کی طرف جا رہی تھی۔ چیخ پکار سن کر اس طرح بوکھلائی کہ برتن پڑاخ سے گر کر پھوٹ گیا۔ لڑکیاں اس کی ہونق صورت دیکھ کر بے تحاشا ہنس پڑیں مائی جیراں تو سرپٹ دوڑی مبادا لڑکیاں ہنستے ہنستے اس کی گردن پر ہی دانت نہ رکھ دیں۔ وہ تو چڑیلیں ہی گمان کر رہی تھی لڑکیوں کو۔

رمضان اور غفور نے گھر میں سامان ٹھکانے لگا لیا۔ دادا جان کے انتقال کے بعد سے گھر ویران و بے آباد ہی رہا تھا۔ لالٹینوں کی چمنیاں چمکائی گئیں۔ بڑے سے چولہے میں بھاڑ جھونکا گیا۔ سیما نے آٹا گوندھا تھا کومل روٹی ڈال رہی تھی پہلی روٹی پڑتے ہی آنچ بڑھ گئی چولہے کے چاروں طرف سے شعلے اژدھے کے پھن کی طرح پھنکارنے لگے۔ توے پر روٹی پڑی تھی مگر ہاتھ اور چمٹا بے بس تھا۔ اتنی تیز آنچ تھی کہ چہرہ جھلسنے لگا کومل بے ساختہ پیچھے

ہٹ گئی۔ ذرا سی دیر میں روٹی جلنے کی بو سارے صحن میں پھیل گئی۔

"ارے رہنے دو کومل نہ کرو اتنی محنت گودام میں بہت کوئلے پڑے ہیں۔ وہی جلائیں گے۔" بینا نے شور مچایا۔

"بیٹھی بیٹھی ان کو باتیں سوجھ رہی ہیں ناں۔ ذرا یہاں آکر دیکھو تو پتا چلے گا۔ توبہ۔ توبہ۔ جہنم میں بیٹھ گئی ہوں۔" آخری جملہ کومل نے بڑبڑاہٹ کے انداز میں ادا کیا۔

دادا جان کی پرانی ملازمہ۔ بانو کھڑی سب تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے تو پہلے ہی پیش کش کر دی تھی۔ کہ بی بی روٹی "فاطو" کے تنور پر لگا لاتی ہوں منٹ میں لگ جائیں گی۔ مگر کومل نے اس دورے کو مکمل ایڈونچر بنانے کے غرور میں بڑی نخوت سے بڑی بی کی پیش کش ٹھکرا دی تھی۔

"نہیں اماں۔ پکا لیں گے ہم۔" آخر اسی چولہے پر سیما نے رمضان کا حلال کیا ہوا مرغ پکایا

یہ الگ بات ہے کہ پوری ٹیم سالن والے معرکے میں شریک رہی تھی۔ بینا اور ربیعہ نے لہسن ادرک چھیلا تھا۔ سنبل نے پیاز کاٹی تھی۔ سمیعہ نے سل بٹے پر اس مرکب کا "پیسٹ" تیار کیا تھا۔ غفور نے دہی کا انتظام کیا تھا۔ پسا ہوا گرم مسالہ وہ گھر سے لائی تھیں۔ دیسی گھی کا ایک پیپا غفور نے آن واحد میں حاضر کر دیا تھا۔ سیما نے مرغ پکایا۔ ربیعہ نے چولہے میں پھونکیں ماریں۔ مگر روٹی کے محاذ پر صرف کومل تھی بقول لڑکیوں کے کہ گلوب یعنی پوری دنیا کا نقشہ صرف کومل ہی روٹی کی صورت میں اتار سکے گی۔ ہم سے تو پاکستان کا نقشہ ہی بن پائے گا اور ایک طرف "خم" زیادہ ہی آئے گا کیوں کہ ہمیں اچھی طرح یاد رہتا ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔ آخر بانو کو آنکھیں رگڑتی کومل پر ترس سا آگیا اور وہ آٹا اٹھا کر (اجازت سے) فاطو کے تنور پر لے گئی۔

خوب ڈٹ کر کھانا کھایا گیا۔ آخر میں چھت پر شل کی دس تاریخ کا چاند پورے گاؤں پر اپنی چاندنی نثار کر رہا تھا۔ بڑے سے صحن میں لائن سے چارپائیوں پر بستر لگ چکے تھے۔ پانچ پانچ چارپائیوں کی دو قطاریں۔ دادا جان دادی جان کی ساری چیزیں اسی طرح اس گھر میں موجود تھیں۔ پھول دار چادریں کڑھے ہوئے تکیے رنگیں خوش نما کھیں۔ سنبل نے منڈیر پر سے صحن میں جھانکا۔ صاف ستھرے بستر دیکھ کر اس کے منہ میں پانی سا آگیا تھکن کا شدت

سے احساس ہونے لگا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ نیچے "جنرل وارڈ" میں جا رہی ہے۔

"چلو ہم بھی چلتے ہیں۔ ابھی تو دس دن ہیں ہمارے پاس۔" ہم نے تھکن کا اظہار کیا۔

"مگر سونے سے پہلے یہ تو سوچو صبح ناشتے کا کیا انتظام ہو گا؟" کومل نے خاتون خانہ کے انداز میں فکریہ لہجے میں پوچھا۔

"دیکھ نہیں رہیں سامنے کس قدر کھیت ہیں۔ وہیں منہ مار لیں گے جا کر۔" گل نے بیزاری سے کہا اس وقت وہ اپنے اعصاب پر سکون رکھنا چاہتی تھی۔ نیند کا بری طرح … تھا۔

"امی نے چار چھ پیکٹ ڈبل روٹی کے رکھوا دیئے تھے۔ بانو بھی لگا کر سینک … انڈے ابال لیں گے۔ کل ضروری چیزیں لکھ لینا غفور شہر جائے گا تو لے آئے گا۔" … زینے طے کرتے کرتے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ غفور اور رمضان باہر اپنے … کسانوں" کے ہمراہ سو رہے تھے۔ لڑکیوں نے "شہرپناہ" کا دروازہ بند کیا۔ ایسا … چوڑا بھاری بھرکم دروازہ تھا کہ دونوں پٹ زنجیروں سے کھینچ کر بند کرنا پڑتے تھے۔ بالکل … کے دروازوں جیسا تھا۔ دروازہ کھینچتے وقت لڑکیوں پر کیا گزری۔ یہ وہی جانیں!

دادا جان نواز حسین خان پاکستان بننے سے پہلے جنوبی ہند کے ایک دیہات میں معمولی سے زمیندار تھے۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ جس پر خود مشقت کرتے تھے۔ ابھی کامرانی کے زینے چڑھے ہی تھے کہ پاکستان بن گیا۔ "کلیم" میں جو زمین ان کے حصے میں آئی وہ "پاکستانی پنجاب" میں تھی۔ اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی۔ زمین انتہائی زرخیز تھی۔ اسی زمین سے انہوں نے آس پاس کی زمینیں بھی خرید ڈالیں۔ ان کے مقدر میں دھن اور اولاد دونوں چیزیں تھیں یہ حویلی نما مکان انہیں ہندوستان کے دو مکانوں کے بدلے ملا تھا۔ ایک مکان ان کا اور ایک ان کے چچا کا تھا۔ جو بے اولاد تھے۔ اور دادا جان نواز حسین کے ہمراہ رہتے تھے۔ چار بچے سرحد پار کرتے ہوئے ان کے ہمراہ تھے۔ چھوٹی پھوپھی سعیدہ پاکستان بننے کے سال بعد پیدا ہوئی تھیں۔ نواز حسین تلاش روزگار میں جنوبی ہند جا پہنچے تھے۔

اس لئے بڑے فخر سے کہا کرتے تھے وہ پیدائشی پاکستانی ہیں۔ انہوں نے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اچھے گھرانوں میں شادیاں کیں۔ بیٹیاں بھی پڑھے لکھے خاندانوں میں بیاہیں بچے شہری ہو چکے تھے۔ مگر نواز حسین اور ان کی بیگم تاحیات گاؤں میں ہی رہے بیٹیوں کے بے انتہا

اصرار کے باوجود۔ دو سال قبل نواز حسین کی بیگم دنیا سے سدھاری تھیں اور گزشتہ برس نواز حسین تمام ترکہ انصاف سے تمام بچوں میں تقسیم کر گئے تھے۔ بیٹے شہری ہو چکے تھے۔ اہم عہدوں پر فائز تھے۔ انہیں فرصت نہیں تھی۔ زمینوں کی دیکھ بھال نوکر کر رہے تھے۔ بیاہی ہوئیں بیٹیاں' داماد نواز حسین سے ملنے گاؤں جاتے رہتے تھے۔ مگر چند بچوں کے سوا کسی نے گاؤں نہیں دیکھا تھا۔ ہوش سنبھالنے پر 'کبھی داخلے کبھی امتحان' کبھی ٹیسٹ 'کومل اور سیما البتہ ہوش سنبھالنے پر کئی بار آ چکی تھیں۔ واپس شہر جا کر ایسا نقشہ کھینچتیں کہ "دیگراں" کے دل بھی گاؤں جانے کو تڑپ اٹھتے۔ دادا جان کا انتقال بھی شہر کے بہترین ہاسپٹل میں ہوا تھا۔ اور دادی جان کا بھی۔ تمام رسومات شہر میں ادا کی گئی تھیں۔ کوئی موقع ہی نہ بن پڑا تھا کہ سب اکٹھے گاؤں کی سیر کو جا سکیں۔

اس مرتبہ شدید گرمیاں ڈھلتے ہی سب لڑکیوں نے گاؤں جانے کا پختہ عزم کیا۔ بزرگوں کی طرف سے "عزم ثبات" میں دراڑیں ڈالنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی گئی۔ جس کے نتیجے میں آج یہ "ٹڈی دل" صحن میں حملہ آور۔ یعنی محو استراحت تھا۔ سب لڑکیاں شاید سو چکی تھیں۔ کومل کو اجنبی جگہ مشکل سے نیند آتی تھی۔ وہ اب بھی چھت پر ہی تھی برابر والے گھر کی چھت پر ہلکی زرد روشنی چاندنی میں بھی نمایاں تھی۔ وہ منڈیر پر کہنیاں ٹکا کر سامنے دیکھنے لگی۔

لکڑی کی میز پر تیل کا بڑا سا لیمپ رکھا تھا۔ لیمپ کے برابر میں موٹی موٹی مجلد کتابیں۔ کتابوں پر کھلی ہوئی سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس لیمپ کے دوسری جانب پانی کا گلاس۔ اس مربع میز کے سامنے ایک صحت مند نوجوان کرتے کی آستینیں کہنیوں تک چڑھائے نوٹ بک پر تیزی سے قلم چلا رہا تھا۔ قلم کی بائیں طرف سے چال بتا رہی تھی۔ جو لکھا جا رہا ہے۔ انگریزی میں لکھا جا رہا ہے۔ ہائیں کیسا پڑھا لکھا بھوت۔ رات کا سناٹا کسی گائے بھینس کے ڈکرانے سے لمحہ بھر کو ٹوٹ جاتا تھا پھر وہی خاموشی۔ ایسے گہرے سناٹے میں اسے بھوت ہی کا تصور آیا۔ اس نے چہرے کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ گھنی مونچھوں نے بالائی لب چھپا لیا تھا۔ رخساروں اور ناک پر سرخی چھلک رہی تھی گھنے سیاہ چمکدار بال لیمپ میں اور زیادہ چمک دے رہے تھے چند لٹیں اس کی پیشانی کو بوسہ دے رہی تھیں اس کا چہرہ کافی جھکا ہوا تھا واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔

اور شاید نوجوان کو بھی اس کی نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سگریٹ منہ میں دبائے دھواں خارج کیا اور ساتھ ہی نظریں اٹھادیں۔ وہ اس کی جانب محویت سے دیکھ رہی تھی۔ چاندنی اس کے چہرے پر پوری پڑ رہی تھی۔ وہ جب سٹپٹا کر پلٹی تو اس کا چہرہ نوجوان نے اچھی طرح دیکھ لیا۔

سفید دودھیا گول چہرہ۔ اس کی ناک پر سوں ہی چھدی تھی نازک سی حسین ناک میں کالا ڈورا پڑا تھا۔ کندھے تک ترشے ہوئے خوبصورت بال خوبصورت آنکھوں میں کاجل کے مٹے مٹے سے نشان۔ وہ تیز روشنی میں تھا۔ اس لئے اس کی مدھم سی شبیہہ ہی نگاہوں میں اتر سکی۔ وہ تیزی سے زینہ طے کر کے اپنے بستر تک آئی۔ توبہ۔ اس طرح نظارہ کرنے کی بھلا کیا تک تھی۔ خدا معلوم کون ہے بس مجھے تو "اسٹڈی" کے اس اسٹائل میں بڑا چارم نظر آیا۔ واہ چاندنی رات کھلی چھت ستاروں بھرا آسمان مٹی کے تیل کا لیمپ۔ ٹھنڈی قدرتی ہوا۔ واہ ہائے یہ پڑھ کیسے رہا ہے ایسے ماحول میں تو انسان کو ایسی پیاری نیند آئے کہ صبح کی خبر لائے۔ میں بھی لاہور جا کر ایک لیمپ منگواؤں گی۔ اوپر چھت پر ایک میز کرسی رکھوں گی۔ جب چاند بڑھا کرے گا تو میں لیمپ جلا کر چھت پر اسٹڈی کیا کروں گی۔ واہ کیا چارم ہے اس میں۔ اس لڑکے کو کتنا مزہ آرہا ہوگا۔ واقعی پڑھائی تو بس ایسے چارمنگ ماحول میں ہونی چاہیے۔ وہ اپنے مطالعے کا ماحول بناتے بناتے جانے کب نیند کی وادیوں میں بھٹک گئی۔

صبح کو متوقع ہنگامہ اترا ہوا تھا۔ وہ تو خیر گزری تھی کہ سیما فجر کی نماز کے لئے اٹھی تھی۔ تو تھوڑی دیر بعد کومل کو بھی اٹھا دیا تھا۔ اسٹول رکھ کر قلعے کے دروازے کی زنجیر گرادی تھی تو غفور اور رمضان نے پٹ دھکیل دیئے تھے۔ وہ ان دونوں کو جاگتا دیکھ کر بہت حیران ہوئے تھے۔ وہ تو سمجھ رہے تھے کہ پوری بنالین شاید دوپہر ہی کو اٹھے گی۔ تھوڑی دیر بعد بانو شفاف برتن میں دودھ لے آئی اور خود ہی بھاڑ جھونک کر دودھ گرم کیا بہت قرینے سے آگ جلائی تھی۔ بانو کو کومل اور سیما نے بغور دیکھا۔ بانو نے پہلے تھوڑی سی کراری لکڑیاں خاص ترتیب سے چولہے میں رکھیں ان پر تھوڑی سی پتلی پتلی کاٹنے ار لکڑیاں رکھیں ایک "اپلا" توڑ کر اس کے ٹکڑوں کو لکڑیوں پر کھڑا کیا پھر تیل چھڑکا اور آگ جلا دی۔ پہلے تو آگ بھڑ بھڑ جلی تیل کی وجہ سے پھر آہستہ آہستہ آگ نے لکڑیوں کو پکڑ لیا۔ صرف لکڑیوں کے جلنے سے آنچ بہت مناسب تھی۔ دھواں بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بانو نے آگ سلگانے کا منظر

لڑکیوں سے کہا۔

...ے دیکھنے پر ...بڑی ماں کے پاس بہت سی "براوے" کی انگیٹھیاں تھیں روٹی تو میں ...لیا۔ حویلی میں بڑی ماں ...یہاں آکر پکا دیا کروں گی۔ چائے دودھ کے کاموں کے لئے انگیٹھی میں ...روں گی۔ سالن یہاں ...بڑی آسانی ہو جائے گی۔" دونوں کو بانو کی تجویز بہت پسند آئی۔

...بھروالیں۔ ...ابلے ہوئے انڈے خالص دیہاتی طرز پر بنی ہوئی چائے کے ساتھ وہیں باورچی ...کے سامنے دری بچھا کر ناشتہ کیا۔ پھر بانو برتن دھونے چلی گئی۔

اب انہوں نے گھر کا جائزہ لیا۔ گھر میں تین جانب کمرے تھے اور ایک جانب "قلعے" کا ...دروازہ کمرے سامان سے اٹے پڑے تھے۔ بڑی بڑی بھاری بھرکم مسہریاں۔ میزیں۔ ...بڑے لوہے کے بکس۔ بکس میں خوبصورت لحاف، کھیس، تکیے۔ چادریں میز پوش، ...دان۔ فرشی دریاں۔ پلنگ پر بچھانے والی دریاں۔ دوسرے بکس میں تانبے پیتل کے ...بڑے بڑے پتیلے۔ جگ۔ بڑی بڑی پراتیں۔

...حسین کے بڑے بھائی عماد حسین کے پاس اس گھر کی اندرونی چابیاں تھیں۔ جو انہوں ...بھائی کو بڑا ذمہ دار جان کر تھمائی تھیں۔ اس گھر کے ساتھ ہی بڑا سا گودام تھا فصل کی کٹائی ...اناج گودام میں بھر دیا جاتا اور یہیں کئی مرحلوں سے گزر کر پیک ہو کر شہر بھیجا جاتا۔ ...اناج شہر بھیجا جاتا تو تینوں بھائیوں میں سے ایک اس وقت ضرور موجود ہوتا ویسے بھی وہ ...جانتے تھے کہ نوکران کی بے نیازی و مصروفیت کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں ان کی زمینوں پر ...گندم اور گنے کی کاشت ہوتی تھی۔

...کسانوں نوکروں کی ادائیگی کے بعد حماد حسین دونوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کی زمینوں ...باقاعدہ تحریری کاغذ کے ساتھ انہیں دیتے۔ زمینوں کے لئے ان کی "محنت" سب ...بھائیوں سے زیادہ خرچ ہوتی تھی۔ مگر اس کا انہوں نے کبھی احسان نہ جتایا۔ اس لئے ...بہن بھائی ان کا اور بھی احترام کرتے تھے۔ چھوٹے پھوپھا کو تو یہ سب جھنجٹ لگتا تھا حماد ...سے کئی بار کہہ چکے تھے کہ زمینیں بیچ ڈالیں مگر حماد حسین انکار کر دیتے کہ سونا اگلتی ...زمین بیچنا دانش مندی نہیں۔ بہرحال حماد حسین کو اپنے بہن بھائیوں کا اعتماد اور احترام ...حاصل تھا۔

...حماد حسین نے ہمیشہ اپنے بچوں کو اتفاق سے رہنے کا درس دیا تھا۔ دونوں بڑی بہوئیں تو

بے حد سادہ اور فرمانبردار تھیں۔ البتہ دونوں سے چھوٹے سجاد حسین کی بیوی ذرا تیکھے
تھیں یعنی رینا۔ بینا۔ مینا کی والدہ۔ مگر وہ انہیں چھوٹا سمجھ کر ہمیشہ ان کی تلخ و ترش
نظرانداز کرتی رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ بھی اپنی جٹھانیوں کے حسن سلوک کی
معترف ہو چکی تھیں۔ پانچوں بہن بھائی ایک ہی شہر کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے
بڑوں میں اتفاق اور محبت ہو تو بچوں میں آپس میں چاہتیں اور زیادہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی
سب بچے آپس میں شیر و شکر تھے۔ چھوٹی پھوپھی کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔
حسین کے چار بچے تھے دو بیٹے دو بیٹیاں۔ ہما اور ربیعہ' طارق اور شارق۔

حماد حسین کی دو بیٹیاں کومل اور سنبل اور ایک اکلوتا بیٹا "ارسلان۔" سجاد حسین کے
چار بچے تھے۔ تین بیٹیاں رینا۔ بینا۔ مینا اور ایک بیٹا جو ان تینوں سے بڑا تھا۔ فاروق۔ محمودہ
پھوپھی کی اکلوتی بیٹی سیما اور دو بیٹے علی اور عمر۔ محمودہ پھوپھی کی شادی سارے بہن بھائیوں
میں سب سے پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت وہ بمشکل اٹھارہ سال کی تھیں۔ تینوں بھائی پڑھ رہے
تھے۔ اس وقت۔ اس لئے ان کے بچے تمام بچوں میں بڑے تھے۔ سعیدہ پھوپھی کی صرف
بیٹیاں تھیں۔ ربیعہ اور سمیعہ۔

گودام دیکھنے کے بعد وہ گاؤں کی سیاحت پر نکل کھڑی ہوئیں بانو کے کچے گھر میں جا کر خوب
اودھم مچایا۔ "اماں! یہ تم کپڑوں کی گٹھڑی کہاں لے جا رہی ہو؟"

"کھالے (نہر) پر جاؤں گی دھونے۔"

"وہاں کیسے دھوؤ گی۔؟" ربیعہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ چلیں میرے ساتھ خود دیکھ لینا۔" بانو نے ٹیڑھی میڑھی اردو میں جواب دیا۔"
آپ لوگ کھیتوں میں بیٹھ جانا۔ بڑا اچھا موسم ہے فصل کھڑی ہے۔"

سوائے سنبل اور سیما کے سب بھاگ لیں۔ نہر پر عجیب رونق تھی۔ کتنی عورتیں لڑکیاں
نہر پر "تختے" ڈالے کپڑے دھو رہی تھیں کوئی نہر سے پانی بھر رہی تھی۔ کوئی تو اپنے برتن بھی
اٹھا لائی تھی مانجھنے کے لئے۔ سب عورتیں فیشن ایبل لڑکیوں کو دیکھ کر چونک گئیں کچھ تو کل
نظارہ کر چکی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے بتایا کہ یہ خان نواز حسین کی پوتیاں نواسیاں ہیں۔
عورتوں اور لڑکیوں نے مسکرا کر انہیں دل میں جگہ دی کافی دیر وہ نہر پر تیز دھوپ میں تپتی
رہیں اور پنجابی میں باتیں کرتی رہیں۔ مگر جب دھوپ ناقابل برداشت لگی تو آس پاس کے

کھیتوں میں بکھر گئیں۔ سامنے والے کھیت میں امرود کا درخت آسمان کو للکار رہا تھا۔ کومل
جھٹ سے درخت پر چڑھ گئی۔ زرد زرد پکے ہوئے امرود وہ موٹی سی شاخ پر نیم دراز ہو کر
کھانے لگی۔ اسی کھیت میں چار سو گنے کی فصل تیار کھڑی تھی۔ یہ چند ماہ میں تیار ہونے والی
تھی۔ مگر کومل نے ایک گنا توڑ کر کھانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اس نے جھولی میں رکھے امرود
میں سے ایک اٹھا کر دانت مارے۔ "اخ تھو" اندر کیڑے تھے اس نے منہ بائیں جانب پھیر
کر تھوکا ساتھ ہی ہاتھ والا امرود بھی۔ مگر ایک دم سٹپٹا کر رہ گئی۔
ایک نوجوان گزر رہا تھا پلپلا امرود اس کی پشت پر جا کر لگا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا اور ادھر
ادھر دیکھنے لگا۔

"اوہ۔ یہ تو شاید وہی رات والا پڑوسی ہے۔" وہ درخت کے نیچے آ کر دیکھنے لگا اوپر کی سمت
ڈارک براؤن سوٹ میں خوبصورت سی لڑکی۔ ناک میں کالا دھاگہ۔ ایک شاخ پر خود تھی تو
دوسری پر دوپٹہ۔

"ہم۔ م۔ میں امرود کھا رہی تھی۔ اس میں کیڑا تھا۔ سس۔ سوری۔" وہ اپنے مخصوص
انداز میں گویا ہوئی۔ نوجوان نے ایک بار پھر اس کی طرف سرسری دیکھا پھر سامنے کھڑے
بڈھے کو آوازیں دینے لگا۔

"چاچا۔ چاچا۔!" بڈھا قریب آیا تو اس نے پنجابی میں کہا۔ کہ کھیتوں کی رکھوالی ایسے
ہوتی ہے جو چاہے آ کر درختوں پر بیٹھ جائے۔ یہ سنتے ہی کومل چھلانگ مار کر اتر آئی۔

"یہ کھیت آپ کا ہے۔؟" وہ نوجوان سے مخاطب ہوئی۔

"آہو جی۔ انان دا اے (ہاں۔ ان ہی کا ہے۔)" نوجوان کے بجائے چاچا نے جواب دیا۔

"کیا کھیتوں میں پوچھ کر آتے ہیں۔؟" اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ اگر ہر کوئی کھیتوں میں آ کر گنے۔ امرود لے جانے لگے تو ہم کٹورا لے کر سڑک
پر بیٹھ جائیں۔" اس نے نگاہ نیچی کئے ہوئے جواب دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔

وہ شرمندہ سی کھڑی رہ گئی۔ دوسری لڑکیاں اسے ڈھونڈتی ہوئی وہیں آ گئیں۔

"ارے تم یہاں کیا کر رہی ہو۔؟" رینا نے اسے بوڑھے کے پاس کھڑے دیکھ کر سوال
کیا۔

"کچھ نہیں۔ چلو گھر چلتے ہیں۔ دیکھیں سیما باجی نے کیا پکایا ہے۔" وہ قلانچ بھر کر آگے

بھاگ لی۔

رات کو کومل سیما اور بانو نے مل کر ملکہ مسور کی دال اور چاول پکائے۔ بانو اپنے گھر سے اچار لائی سب نے چھت پر دری بچھا کر کھانا تناول کیا۔ ہنسی مذاق لطیفے نقلیں ایک ہنگامہ بپا ہوا تھا۔

"اللہ اپیا۔ برابر والے گھر میں ایک لڑکی ہے۔ سوہنی۔ ہائے وڈی سوہنی اے۔ ہم جب میں اور بانو فاطو کے تنور پر گئے ناں تو وہ بھی روٹی لگانے آئی تھی۔ ہائے اتنی پیاری باتیں کرتی ہے۔ میں نے کل اسے دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے۔" سنبل نے تفصیل بتائی۔

"دوپہر کے کھانے پر۔" سمیعہ ہنسی "پکا پکایا مل رہا ہے ناں دعوتیں بھی شروع ہو گئیں کل دوپہر کو بھاڑ میں کیا جھونکو گی میرا مطلب ہے کیا پکاؤ گی۔؟"

"ارے وہ کون سی ملکہ شہزادی ہے اتنی سادہ کہ کیا بتاؤں۔ میں نے اس سے وعدہ لیا ہے وہ ضرور آئے گی۔ میں نے اسے دوست بنا لیا ہے۔" سنبل نے اطلاع دی۔

"کوئی خاص خبر نہیں۔ تم دنیا کے جس خطے میں جاتی ہو وہاں تمہاری کوئی نہ کوئی دوست خود بخود "اگ" آتی ہے۔" بینا نے چھیڑا۔

"ہائے جی مجھے تو یہاں بھوک بہت لگتی ہے۔" ربیعہ نے دکھڑا سنایا۔

چلو اسی بہانے تم پر گوشت تو چڑھے گا۔" بینا نے اس کے دبلے پن پر چوٹ کی۔

سب قہقہہ مار کر ہنس دیں۔

"ارے یہ کومل آج بہت خاموش ہے۔" رینا نے اسے ٹھوکا دیا۔

"امی کہتی ہیں کھانا خاموشی سے کھانا چاہیے ورنہ شیطان بھی شامل ہو جاتا ہے۔" بناوٹی سنجیدگی سے بولی۔

"ارے بہت ہے کھانا۔ کتنا کھا لے گا شیطان۔؟ کھانے دو۔ مگر یار بولو تو سہی۔" رینا نے ہنس کر کہا۔ پھر کھانے کے بعد سب ٹہلتے ٹہلتے آج کی روئیداد دوہرانے لگیں۔

بانو نے بستر لگا دیئے تھے۔ سارا دن کی تھکی ماندی لڑکیاں بے فکری سے بستروں پر ڈھے گئیں۔ سب چلی گئیں تھیں نیچے۔ کومل اور سیما اوپر ہی تھیں۔ وہ منڈیر پر کہنیاں ٹکا کر نیچے صحن میں جھانک رہی تھی کہ سیما نے اسے بلایا۔

"شش!" وہ چونک کر پلٹی۔

"ادھر آؤ۔" وہ اس کی جانب بڑھ گئی۔ "سامنے والی چھت پر دیکھو اقبال ثانی بیٹھے ہوئے ہیں۔ کتابیں کھلی ہوئی سوچوں میں گم۔ سفید شلوار قمیص میں آج سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اور قلم سے کان کھجا رہا تھا۔ لیمپ کی تپش سے گویا چہرے پر خون چھلکنے لگا تھا۔ پھر اس نے ایک سگریٹ نکالی اور سلگانے لگا۔ دو تین کش ایک ساتھ لے کر وہ کرسی سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا اور دیکھتے ہوئے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"کومل۔ یہ دیپک پراشر سے مل رہا ہے نا۔" سیما نے ایک انڈین ہیرو کا نام لیا اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"ارے بھئی مجھے کیا۔ بلکہ ہمیں کیا۔ دیپک میں ملے یا چراغ میں۔"

"دیکھو۔ گاؤں کے لڑکے کتنی محنت سے پڑھتے ہیں۔ ایک ہم لوگوں کے ہاں ایئر کنڈیشنڈ اسٹڈی روم بنا کر دے رکھے ہیں۔ پھر بھی ففٹی پرسنٹ سے آگے نہیں جاتے بہت ہی تیر مار لیا تو ففٹی نائن تک آ جائیں گے۔" سیما نے محنتی لڑکے کی تعریف کے ساتھ اپنی بپتا بھی کہہ ڈالی۔

"تمہیں لڑکا نظر آتا ہے؟" کومل نے گویا کور نظری کا طعنہ دیا تھا سیما کو۔

"نہیں تو کیا مریخ کی مخلوق لگ رہا ہے تمہیں۔" سیما نے بھی برا مان کر کہا۔

"میرا مطلب ہے۔ یہ تو اچھی خاصی عمر کا مرد ہے۔ مجھے تو بلکہ شادی شدہ بھی لگتا ہے۔"

"اتنے میں وہ کھڑا ہو گیا تو دونوں ذرا نیچے ہو گئیں۔ اب وہ چھت پر ٹہل رہا تھا اونچا لمبا چوڑا پورا مرد۔

"مجھے تو پنجابی فلموں کا ہیرو لگ رہا ہے۔"

"یہی خرابی ہے تم میں' بات ایک نہیں ہوتی تمہاری۔ ابھی تو تم نے بے چارے کو دیپک پراشر بنا دیا تھا۔" اس نے سیما کو لتاڑا وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

وہ مسلسل ٹہل رہا تھا۔

"غالباً" موصوف تحصیل علم میں اس قدر کھو چکے تھے کہ کھانا ہضم کرنا بھول گئے تھے۔"

"تمہارے خیال میں بے چارا کھانا ہضم کر رہا ہے؟" سیما نے دریافت کیا۔

"ہو سکتا ہے کوئی علمی گتھی سلجھا رہا ہو بلکہ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے گویا سلطان راہی دشمن کا انتظار کر رہا ہو۔"

"توبہ توبہ۔ مظلوم کا سلسلہ کہاں پہنچا دیا تم نے۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"فلم میں دشمن کے علاوہ ڈھائی من کی ہیروئن بھی تو ہوتی ہے ہو سکتا ہے۔"

"میں آکھیا جی گنڈا سا وی چاہی دا۔ (میں نے کہا جی گنڈا سا بھی چاہیے؟)"

وہ شرارت سے گویا ہوئی تھی۔ سیما نے اس حرکت پر اس کا پاؤں دبا دیا۔ حالانکہ اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"سوائے خاموشی کے مجھے اس وقت کچھ نہیں چاہیے۔" وہ رک کر گویا ہوا تھا۔ اور ان کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔

"معذرت کے ساتھ عرض ہے اگر آپ نے مجھ پر اظہار خیال مکمل کر لیا تو میں اپنا کام کر لوں۔"

اتنی شستہ اردو' مہذب لہجہ' وہ شرم سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔ گویا ان کی آواز اس تک پہنچ رہی تھی۔ وہ گم سم سی رہ گئیں۔ وہ میز سے کافی فاصلے پر تھا۔ اور ان کے کافی نزدیک۔

اس نے سر جھکا کر سگریٹ کا ایک طویل کش کھینچا پھر سر اونچا کیا دونوں کو باری باری دیکھا وہ صرف گردن تک کی جھلک دکھا رہی تھیں منڈیر کافی اونچی تھی۔ دونوں کے دودھیا بازو منڈیر پر جمے ہوئے تھے۔ اس نے کومل کو دیکھا بے اندازہ دلکشی سے مسکرایا وہ بری طرح سٹپٹا کر پیچھے ہو گئی۔ دونوں تیزی سے نیچے آ گئیں۔

"اف توبہ۔ یہ کیا حرکت کی تھی کومل! خدا جانے ہمیں کس قماش کی سمجھ رہا ہو گا کہ آدھی رات کو لڑکے سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں۔"

"ہمیں کیا ہم کون سا یہاں قیام کرنے آئے ہیں۔ ہونہہ!" وہ چادر تان کر سو گئی۔

"اے۔ مجھے سوچ سوچ کر پریشانی ہو رہی ہے کہیں اس نے ہماری ساری باتیں نہ سن لی ہوں۔" سیما نے اس کی چادر کھینچی۔

"تو کیا کرے گا۔ مجھے پریشان نہ کرو' سخت نیند آ رہی ہے۔" اس نے جھلا کر کہا حالانکہ دل ہی دل میں وہ بھی بری طرح کھسیائی ہوئی تھی۔

"ہائے جی۔ مجھے تو نیند ہی نہیں آ رہی مارے کوفت کے۔" سیما نے آہستگی سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"ابھی تو پڑھ ہی رہا ہے' جاؤ معافی مانگ آؤ۔" اس نے اطمینان سے حل بتایا۔

"میں کیوں مانگوں معافی۔؟" سیما بھڑک گئی۔ "میں نے کیا کہا ہے۔"

"تو پریشان کیوں ہو رہی ہو جب کچھ کہا ہی نہیں؟" وہ چادر میں منہ دیے دیے بولی۔

"میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ۔"

"خدا کے واسطے سیما!" کومل نے چادر میں سے منہ نکال کر سیما کو منت سے دیکھا۔

"کیوں پریشان ہوتی ہو۔؟ گاؤدی دیہاتی لڑکا ہے۔ ہمیں کیا پڑی ہے۔" اس نے چادر میں منہ دیے دیے تسلی دی۔

"ارے اچھا خاصا پڑھا لکھا لگتا ہے۔" سیما اتنا کہہ کر لیٹ گئی۔

"تم دونوں ابھی تک "بج" رہی ہو۔" رینا نے نیند ٹوٹنے پر بڑبڑا کر کہا۔

"سو جاؤ تم' آف ہو رہے ہیں ہم بھی۔" وہ دبی دبی ہنسی میں بولی۔ رینا واقعی سو گئی پیٹھ موڑ کر۔

◇

"اپیا۔ رینا باجی۔ دیکھیں یہ رہی میری نئی دوست۔"

سنبل "شہرپناہ" کے پھاٹک سے پکارتی آ رہی تھی۔ رینا طاہری پکا رہی تھی۔ کومل چولہے میں پھونکیں مار رہی تھی۔ رمضان کہہ رہا تھا۔ آج شام تک برادے کی انگیٹھی تیار ہو جائے گی۔ گاؤں کی مخلص عورتوں نے پیشکش کی تھی کہ کھانا ہم پکا دیا کریں گے۔ مگر سیما نے منع کر دیا کہ روٹیاں تو پکا دیتی ہیں یہی بہت ہے ویسے بھی ہم پکنک منانے آئے ہیں۔ بلکہ انجوائے کرنے۔ بانو کی بیٹیاں صبح برتن جھاڑو کر جاتی تھیں۔ لڑکیاں تو بس ادھر ادھر گھومتی پھرتی تھیں۔ گاؤں کے بزرگ نواز حسین کی پوتیوں اور نواسیوں کے فیشن دیکھ کر توبہ تلا کرتے رہتے تھے۔

کومل نے آنکھیں مسل کر سنبل کے ساتھ آئی پری چہرہ ناری کو دیکھا بلاشبہ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ اس کے حسن میں حزن جھلک رہا تھا۔ سرخ چھینٹ کے پھول دار سوٹ اور سرخ چادر میں وہ انگارہ بنی دہک رہی تھی۔ ہاتھوں میں سونے کے موٹے موٹے کڑے ناک میں سونے کی لونگ کانوں میں بھاری آویزے۔ چہرہ ہر قسم کی تکلفات سے پاک حسن ایسا کہ سیدھا دل میں اتر گیا۔ وہ سب اس کی جانب متوجہ تھے۔

"سیما باجی۔ دیکھیں یہ میری ہم عمر لگتی ہے۔ مگر دیکھیں یہ شادی شدہ ہے۔" سنبل نے

رسائی کی۔

"تو پھر تمہارے کیا ارادے ہیں۔؟" سیما نے چھیڑا۔

"ارے میں تو تعارف کرا رہی ہوں۔" سنبل کچھ جھینپ کر کچھ برا منا کر بولی۔

"نام کیا ہے اس کا۔؟" ربنا نے پوچھا۔

"شاہدہ!" سنبل پھر بولی شاہدہ بوکھلائی ہوئی ابھی تک خاموش تھی۔

سنبل موڑھا گھسیٹ کر لائی۔ "بیٹھو شاہدہ۔"

"تمہارے میاں کا کیا نام ہے۔؟" کومل نے اشتیاق سے پوچھا۔

"سلیم۔ خان سلیم۔" اس نے پہلی مرتبہ دھیمے سروں میں لب کشائی کی۔

"اچھا تو تم شہزادہ سلیم کی انار کلی ہو۔" بینا ہنسی۔

"ہیں جی۔؟" شاہدہ نے سٹپٹا کر بینا کو دیکھا۔ لڑکیوں کے قہقہے بلند ہو گئے شاہدہ گھبرا کر رہ گئی۔

"بچے ہیں تمہارے۔؟" ربیعہ کو ہمیشہ دور کی سوجھتی تھی۔ شاہدہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ تمہاری سسرال ہے۔؟" ہما نے پہلی مرتبہ حصہ لیا۔

"ارے نہیں ہما آپی۔ یہ تو ان کی امی کا گھر ہے۔ یہ تین بہنیں ہیں۔ ان کے بس ایک ہی بھائی ہیں۔ پتہ ہے کیا ڈبل ایم اے ہیں۔ ایم فل کر رہے ہیں کل ملے تھے مجھے، شہر میں ملازم ہیں۔ کراچی میں آج کل آئے ہوئے ہیں۔ بہت اچھے ہیں ان کے بھائی ان کی امی بھی بہت اچھی ہیں۔" سنبل واقعی کافی معلومات رکھتی تھی۔

"شاہدہ۔ گڈو کو بھی لے آتیں۔ اللہ کتنا کیوٹ بچہ ہے۔ بے حد پیارا، آپ اس کی باتیں سنیں تو حیران ہو جائیں۔"

"گڈو۔؟" سب نے حیران ہو کر شاہدہ کو دیکھا ابھی تو کہا گیا تھا شاہدہ کا کوئی بچہ نہیں۔

"ارے ایا۔ شاہدہ کے بھائی کا بیٹا ہے۔"

"بھائی کا بیٹا۔؟" کومل نے حیرانی سے شاہدہ کو دیکھا۔ بھابھی کا ابھی تک کوئی ذکر نہیں آیا۔

"تمہاری بھابھی کیسی ہیں؟ سیما نے تجسس سے پوچھا۔

"اچھی ہیں جی۔" شاہدہ نے سرسری انداز میں کہا۔

"ملواؤ گی نہیں۔؟" کومل نے جانے کس جذبے کے تحت کہا۔

"وہ جی اپنی ماں کے گھر ہیں۔"

"کب آئیں گی۔؟"

"رب جانے۔" شاہدہ کی آنکھ سے بے ساختہ ایک آنسو ٹپک گیا۔

"ارے تم رو رہی ہو۔" سمیعہ نے کہا تو سب اس کی صورت دیکھنے لگیں۔

"ایا! یہ کل بھی رو رہی تھی۔" سنبل نے اطلاع بہم پہنچائی۔

"کیوں بھئی؟ کیوں رو رہی ہو۔ دیکھو ہم تمہاری بہنیں ہیں ہمیں بتاؤ۔"

کومل نے چار[illegible]ری کی کوشش کی۔ مگر ازحد اصرار کے باوجود وہ ایک لفظ نہ بولی۔

سیما نے سب کو اشارہ کیا وہ خاموش ہو رہیں۔

انہوں نے اسے زبردستی اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ اگلے روز وہ سب دیہاتی لڑکیوں کے ہمراہ کھیتوں میں جا رہی تھیں کومل کو عجیب بوریت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ رمضان اور غفور قریبی شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ ریڈیو ایک اسٹیشن پر لگا کر باورچی خانے کے سامنے بچھے تخت پر لیٹ گئی۔ خبریں آنے لگیں تو اس نے ریڈیو بند کر دیا۔ اور اٹھ کر بڑے برآمدے سے گزر کر "شہرپناہ" کے "پھاٹک" سے باہر آکر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ حسب معمول گاؤں دوپہر کو سنسان ہو رہا تھا۔ عورتیں کھانا لے کر کھیتوں میں گئی ہوئی تھیں۔ یا کپڑے برتن دھونے اور پانی بھرنے ایک دو بوڑھی عورتیں گھروں کے آگے بنے چبوتروں پر درختوں کی چھاؤں میں بیٹھی تھیں ہاتھ میں رنگ برنگی جھالروں والے کھجور کے پنکھے تھے۔

اس نے دیکھا شاہدہ سامنے والے کنوئیں سے پانی بھر کر گھڑا بغل میں دابے آہستہ آہستہ آ رہی تھی کومل کو دیکھ کر مسکرائی۔ "آپا۔ کلی کھڑی ہو۔" اس نے اردو بولنے کی کوشش کی۔

"وہ ساریاں کہاں ہیں۔؟"

"وہ ثریا کے کھیت میں گئی ہیں۔ انہیں گرمی لگ رہی تھی کہہ رہی تھیں نہر میں پاؤں ڈال کر بیٹھیں گے۔" کومل نے ہنس کر بتایا۔

"تم کیوں نہیں گئیں۔؟"

"بس ایسے ہی سستی سی آ رہی ہے۔" وہ کاہلی سے مسکرائی۔

"میرے گھر چلو گی۔ چلوناں' میں بھی کلی ہوں بے بے کھالے (سہ) پر گئی ہوئی ہے۔ گڈو ان کے ساتھ گیا ہے۔"

وہ جانے کیوں شاہدہ کے ساتھ اس کے گھر چلی آئی نہ چاہتے ہوئے بھی۔ تین کمروں کا آدھا کچا آدھا پکا گھر تھا۔ ایک کونے سے اوپر زینہ جا رہا تھا۔ تو دوسرے کونے پر غالباً "باورچی خانہ اور گودام تھا۔ بڑا صحن تھا۔ جس میں جانور باندھنے والے کھونٹے گڑے تھے۔ دیواروں میں کئی جگہ "طاق" بنے ہوئے تھے کسی طاق میں لالٹین اور کسی میں "دیا" رکھا تھا۔ چکنی مٹی سے لپا پتا صاف ستھرا بلکہ انتہائی صاف ستھرا گھر تھا۔

وہ دو تین مرتبہ گاؤں آئی تھی۔ مگر سوائے بانو۔ فاطمہ اور ثریا کے گھر کے وہ اور کہیں نہیں گئی تھی۔ امی ہی اسے تنہا باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔

"تم نے روٹی کھالی ہے۔؟"

"نہیں۔ وہ سب آجائیں پھر کھائیں گے۔" اس نے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر تم میرے ساتھ روٹی کھاؤ۔ ابھی لگائی ہے میں نے تنور پر روٹی' بیسن کی روٹی ہے۔ تمہیں اچھی تو نہ لگے گی۔ شہر جیسے کھانے نہیں ہوتے ناں پر تم مجھے بہت اچھی لگی ہو۔ اس لئے آج تم میرے ساتھ روٹی کھاؤ۔"

"تمہارا میاں کیا کام کرتا ہے۔؟" اس نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"زمیندار ہے جی۔ میرے چاچے کا بیٹا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بتاتی ہوئی باورچی خانے میں بڑھ گئی۔ وہ لکڑی کی بدرنگ کرسی پر بیٹھ گئی۔ گھر میں ہو کا عالم تھا۔

وہ سر جھکائے جانے کہاں پہنچ گئی۔ گلابی کرتے سیاہ شلوار دوپٹے میں ملبوس وہ سوچوں میں گم بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ اسے ایک نظر میں پہچان گیا۔ وہی تراشیدہ بال وہی خوبصورت ناک میں سیاہ دھاگہ۔ اس نے زور سے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سرمئی قمیض شلوار میں وہ پسینے میں شرابور کھڑا تھا۔ کومل بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

"السلام علیکم!" اس نے سلام میں ہی سلامتی سمجھی رات کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا۔

"وعلیکم السلام۔" کہتے ہوئے وہ سامنے کمرے میں بڑھ گیا۔

شاہدہ قدموں کی بھاری چاپ پر باورچی خانے سے باہر آگئی تھی۔ بھائی کو دیکھ کر وہ اس

کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ جب واپس آئی--------- تو بتایا کہ بھائی میری وڈی بہن سے ملنے ساتھ والے گاؤں گیا تھا۔ خوش ہے وہ اپنے گھر' بہن کی خوشی کی خبر شاہدہ نے افسردگی سے سنائی تھی یا پھر کومل نے ہی ایسا محسوس کیا۔

شاہدہ واپس باورچی خانے میں جا چکی تھی۔ شاہدہ کا بھائی کپڑے بدل کر باہر آگیا تھا۔ "سبز لاچے" "سفید کرتے میں وہ خود اعتماد سا نوجوان ساتھ لایا ہوا اخبار کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی موجودگی سے قطعی بے نیاز۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی جانب دیکھا اس کے صحت مند مردانگی سے بھرپور چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ خوبصورت سیاہ بال قرینے سے سجے تھے۔ اس نے اچانک نظریں اٹھائیں تو وہ بری طرح گڑبڑا گئی نوجوان کے چہرے پر ٹھنڈی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ معا" اس کی آواز ابھری۔

"آپ خان نواز حسین کی پوتی ہیں یا نواسی۔؟"

"پوتی ہوں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"پڑھتی ہیں بی بی! آپ۔؟" عجیب بزرگانہ انداز تھا۔

"جی ہاں۔ بی۔ اے فائنل میں۔"

"شاہدہ' بھئی ان کے پاس آکر بیٹھو۔"

"آرہی ہوں بھائی۔! ہم روٹی کھائیں گے ابھی ساتھ بیٹھ کر میں میٹھی دہی بنا رہی ہوں۔"

"میں نے زاہدہ کے ہاں کھالیا تھا۔ میرے لئے نہ لانا۔" اس نے بہن کو ٹھیٹھ پنجابی میں بتایا۔

اس کے منہ سے پنجابی سن کر وہ مسحور سی رہ گئی عجیب چاشنی سے پر لہجہ تھا پھر وہ اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔

"شاہدہ! آج رات کو ثریا کے کھیت کے سامنے جو زمین ہے ناں وہاں ہم سب "اندھا بھینسا" کھیلیں گے تم بھی چلنا۔" اس نے خوش دلی سے بلکہ معصومانہ انداز میں شاہدہ کو دعوت دی۔

"یہ کیسے کھیلتے ہیں۔؟" شاہدہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ارے بڑا آسان سا کھیل ہے۔ آنکھ مچولی ٹائپ کا۔ بہت جلدی سمجھ میں آجائے گا۔"

کومل کو یہ یک بیک خاموشی اور یک بیک شور والا کھیل بہت پسند تھا۔ جس ممبر کے آنکھ

پر پٹی بندھی ہوتی تھی۔ جب تک وہ ہاتھ مار کر ڈھونڈتا رہتا سب کے سانس رکے رہتے جہاں
وہ کسی کو چھوتا ایک ہاؤ پکار مچ جاتی۔

اس نے میٹھی دہی اور اچار سے بیسنی روٹی کھائی بہت لطف آیا۔ جب وہ واپس آئی تو سب لڑکیاں اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

"بانو نے بتایا کہ آپ شاہدہ کے ہاں ہیں میں بلانے ہی جا رہی تھی۔ بڑی سخت بھوک لگ رہی ہے۔" سنبل نے کہا۔

"ابھی میں نے تو کھا لیا ہے۔ شاہدہ نے زبردستی کھلا کر کل کا بدلہ اتار دیا ہے۔ اب تو میں ذرا سوؤں گی۔" وہ تخت کی جانب بڑھ گئی۔ جانے کیوں سیما نے اسے غور سے دیکھا تھا۔

◇

رات کو کھانے پینے سے فارغ ہو کر بانو اور شاہدہ کو لے کر ثریا کی زمین پر چلی آئی تھیں۔ سیما نے سر درد کا عذر بتا کر اپنی جان چھڑالی تھی۔

سب سے پہلے ثریا کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ سب نے باری باری اطمینان کیا کہ کہیں سے ثریا کو نظر تو نہیں آ رہا۔ پھر مطمئن ہو کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ چند منٹوں کی محنت کے بعد اس نے کومل کو چھو ہی لیا۔

کومل کو لڑکیوں نے بہت ستایا۔ جانے کہاں جا گھستی تھیں۔ تنگ آ کر کومل نے بے ایمانی کرنا چاہی۔ یعنی پٹی سرکانا چاہی تو ایک شور مچ گیا۔ گویا اس کی ایک ایک حرکت پر ان کی نظر تھی۔ آخر کب تک وہ گھومی ہی تھی اس کا سر کسی لڑکی سے ٹکرایا۔ اس نے چیخ مار کر دبوچ لیا۔ جانے کون صحت مند لڑکی تھی کہ اس کے بازو بمشکل اس کے وجود کو قید کر سکتے تھے۔ مارے خوشی کے اس نے پکڑی جانے والی لڑکی کو اٹھا کر چکر دینا چاہا تو بے شمار قہقہے ابل پڑے۔ اس نے گھبرا کر پٹی نیچے کی کہ وہ اس وجود کو جنبش بھی نہ دے سکی تھی۔ سامنے شاہدہ کا بھائی تھا۔ جو بوڑھے رکھوالے کو پانی چھوڑنے کی ہدایت دینے آیا تھا۔ اس کے ساتھ تین چار سال کا بچہ تھا جو قل قل کرتا ہنس رہا تھا۔ اور کومل کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں۔

"مم۔ معاف کیجئے گا۔" وہ یہ کہہ کر پلٹ گئی۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ لوگ تو بالکل بچیاں ہیں۔" شاید فولادی اعصاب رکھتا تھا یہ

شخص کسی بات سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔

"ابو۔ یہ آنٹی آپ کو پکڑ رہی تھیں کیوں؟" بچے کی خوبصورت میٹھی آواز۔ مہذب لب و لہجہ۔ "بیٹا" اس کی بیوی پڑھی لکھی ہوگی۔ کوئی شہری لڑکی۔ سب لڑکیوں کے ذہن میں یہی خیال آیا۔

"بیٹا یہ آنٹی سے پوچھو۔ بلکہ آنٹیوں کو بتاؤ یہ شہر نہیں گاؤں ہے یہاں ذرا سنبھل کر رہیں۔ چلو شاہدہ۔" اس نے سنجیدگی سے بہن کو مخاطب کیا۔ اور خود بچے کی انگلی تھامے آگے بڑھ گیا۔ شاہدہ اس کے پیچھے ہی چل پڑی۔

سب لڑکیوں کو اس کا ناصحانہ انداز سخت ناپسند آیا تھا۔

"ہم بڑا ان کے گاؤں میں 'ٹھیہ' جمانے آئے ہیں۔ ہونہہ سنبھل کر رہو۔" مینا نے کچھ زیادہ ہی برا منا لیا تھا۔

◇

واپس آ کر لڑکیوں نے مزے لے لے کر سیما کو سارا واقعہ سنایا۔ کومل بڑی بے نیازی سے بیٹھی رہی۔ بانو نے گھڑے بھرے اور بتا کر اپنے گھر چلی گئی۔

سیما نے دودھ حفاظت سے رکھا اندرونی دروازوں کی زنجیریں چڑھائیں۔ پھر پھاٹک کا مڑ کر سرکیا۔ آج سیما اور کومل چھت پر ٹہل لگانے کے بجائے اپنے بستروں میں تھیں۔

کومل کو کچھ دیر پہلے کا واقعہ سوچ سوچ کر حیا آ رہی تھی۔ خیر میں نے کوئی جان بوجھ کر تو نہیں کیا تھا نا۔ اس نے اپنے ضمیر کو تسلی دی۔

"ہو سکتا ہے۔ یہاں سے جاتے ہی تمہاری منگنی ہو جائے۔" سیما کو اچانک اس کی منگنی یاد آ گئی۔

"ہیں۔؟" وہ ایک دم ------- سے چونک پڑی۔

"افضال کے گھر والے باز آنے والے نہیں ماموں جان سے اقرار ہی کرا کر ٹلیں گے۔ ہو سکتا ہے رشتہ طے بھی کر دیا ہو ماموں جان نے۔ آخر ان کے گہرے دوست ہیں اقبال انکل۔"

"خیر اتنی جلدی بھی نہیں ابھی چاکو۔" وہ بات ختم کرنے کے انداز میں بولی۔

"شاہدہ۔ پتا نہیں اتنی افسردہ کیوں رہتی ہے۔" سیما آج باتیں کرنے کے موڈ میں لگ

تھی۔

"کیا معلوم۔" کومل نے پھر اختصار سے کام لیا۔

"اس کی بھابی نظر نہیں آئی کتنا پیارا بچہ ہے۔"

"ہوں۔!"

"لگتا ہے میاں بیوی میں جھگڑا ہے۔ ورنہ بچہ اپنی ماں کے ساتھ نہ رہتا۔؟"

"ہوں۔!"

"یہ تو کراچی میں رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی بیوی کراچی میں ہو۔"

ہو سکتا ہے اس کی بیوی کراچی میں ہو۔"

"ہوں۔!"

"شاہدہ کے گھر والوں کو چاہیے۔ کراچی جا کر رہیں چھوڑیں اس گاؤں کو۔ کراچی تو [illegible] آفت شہر ہے۔ ہے ناں۔؟"

"ہوں۔!"

"میرا تو دل چاہتا ہے کراچی میں رہائش اختیار کی جائے۔ کراچی سے جو لوگ لاہور آئے ہیں ان کی اردو کتنی اچھی ہوتی ہے 'ق' 'ک' کے نمایاں فرق کے ساتھ۔ لگتا ہے سارے لکھنؤی دہلوی کراچی ہی میں مقیم ہیں۔"

"سن رہی ہو تم۔؟ ارے سو گئیں۔" "لاحول ولا قوۃ" سیما نے چڑ کر سر تک چادر کھینچ لی۔

◇

دسویں روز جب بھائی نے وین بھجوائی۔ آتی مرتبہ تو وین کو آفس ورک کی وجہ سے جلدی تھی۔ لہٰذا نزدیکی شہر تک چھوڑ گئی تھی۔ اور انہوں نے باقی ماندہ سفر تانگے بلکہ "تانگوں" میں کیا تھا۔ اس بار وین گاؤں آگئی تھی۔ لڑکیاں سامان باندھنے میں مصروف ہو گئیں۔ یہ بکسوں میں چیزیں رکھ رہی تھی ساتھ ہی مقفل کر رہی تھی۔

تب وہ دکھیا آنکھوں والی شاہدہ سے ملنے چلی آئی ابھی اسے ثریا کے ہاں بھی جانا تھا لہٰذا وہ عجلت میں تھی۔ سامنے داخل ہوتے ہی گڈو پر نظر پڑی وہ چمچ سے انار کے سرخ سرخ دانے کھا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بے تکلفی سے مسکرایا۔

"آپ کی پھوپھی کہاں ہیں گڈو۔؟"

"پتا نہیں۔" گڈو نے بے نیازی سے جواب دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

"پڑھتے ہیں آپ۔؟"

"جی۔!"

"کہاں کراچی میں۔؟"

"ہوں۔" (منہ میں انار کے دانے تھے)

"کیا نام ہے آپ کے اسکول کا۔؟"

"گولڈن کیریر۔"

"کون سی کلاس میں ہیں۔؟"

"کے۔ جی۔ ون۔"

"واہ۔!"

"پتا ہے آنٹی۔ مجھے پوری پوئمز یاد ہیں۔" اس نے انار کا پیالہ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "سیونتھ تک کے ٹیبلو آتے ہیں۔ سناؤں۔" مخلصانہ پیش کش ہوئی۔

"پھر سنیں گے آپ کی پھوپھی کہاں ہیں، ہم آج جا رہے ہیں یہاں سے، ان سے ملنے آئے تھے۔" اس نے گڈو کے رخسار کا بوسہ لیا۔

"آنٹی آپ کہاں جا رہی ہیں۔؟"

"لاہور۔ مسلم ٹاؤن میں ہمارا گھر ہے۔"

"پھر یہ گھر کس کا ہے۔؟" (بلا کا ذہین بچہ تھا)

"یہ بھی ہمارا ہے۔"

"ہاہا۔ آپ دو گھروں میں کیسے رہتی ہیں۔؟" ہنس کر مذاق اڑایا گیا۔

"جیسے آپ رہتے ہیں۔ آپ کے بھی تو دو گھر ہیں، ایک یہ اور ایک کراچی میں۔"

"ہم تو یہاں نہیں رہتے، دادا ابا سے ملنے آئے ہیں، آپ کس سے ملنے آئی تھیں۔؟"

"ہم آپ سے ملنے آئے تھے۔" وہ بچے کے سوالوں سے زچ ہو کر ہنس پڑی۔

پھر اسے گود میں بٹھا کر اس کا منہ صاف کرنے لگی۔

"بیٹا کراچی میں کون کون رہتا ہے۔۔؟"
"میں اور ابو اور ماریا آنٹی۔"
"ماریا آنٹی۔۔؟ یہ کون ہیں۔۔؟"
"آنٹی ہیں" بے نیازی سے جواب ملا۔
"اور آپ کی امی۔۔؟ امی کہاں رہتی ہیں۔۔؟"
"یہ کیا بتا پائے گا مجھ سے پوچھ لیجئے۔ اس کی ماں اسے دو سال کا چھوڑ کر میرے گھر سے چلی گئی تھی۔ ماریا۔ آیا ہے میرے بیٹے کی۔ میرے والدین شہر آنے پر راضی نہیں اور میں بچے کو گاؤں میں رکھنے پر راضی نہیں۔ اور کچھ۔۔؟"
"میں تو شاہدہ کے انتظار میں ایسے ہی باتیں کرنے لگی تھی' میرا مقصد۔" کومل نے گڑبڑا کر اس کی حسین گہری آنکھوں کو دیکھا جو ہر جذبے سے عاری تھیں سیاہ گھور چمکتی آنکھیں۔
وہ نظر جھکا کر رہ گئی۔
"میں۔ میرا مطلب ہے کہ ہم لوگ واپس گھر جا رہے ہیں۔ اس لئے شاہدہ سے ملاقات کرنے آئے تھے۔"
"آپ بیٹھیں شاہدہ آتی ہوگی۔ لگی ہوگی ماں کے ساتھ کسی کام میں۔"
وہ یہ کہہ کر سامنے بڑھ گیا۔ مگر وہ شاہدہ کا انتظار کیے بغیر واپس پلٹ آئی۔ وہ باہر آئی تو کچھ لڑکیاں ادھر ہی آ رہی تھیں۔
"ارے تم شاہدہ کے ہاں گئی تھیں۔ ہم ادھر ہی جا رہے ہیں" سیما نے کہا۔
"شاہدہ گھر پر نہیں ہے۔ نہ اس کی ماں۔ صرف اس کا بھتیجا تھا۔ اور شاہدہ کا بھائی میں نے سوچا۔ کیا کروں گی انتظار کر کے۔ شاید راستے میں مل جائے۔ کیا پتا نہر پر ہو۔" اس نے کافی تفصیل سے کام لیا۔
"ایک تو تم ہمیں کبھی کہہ کر نہیں جاتیں کہ کہاں جا رہی ہو۔ ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔" سیما نے جھاڑ پلائی۔
خلاف معمول وہ خاموش رہی۔
مگر تھوڑی دیر بعد دین میں معمول کی طرح چہک رہی تھی۔

"اللہ ـــــــ امی کیا بتاؤں۔ کتنا مزہ آیا۔ ہم نے لکڑیوں کے چولہے پر کھانے پکائے۔"
"یقین نہیں آتا۔ یہاں تو تم کو انڈا ابالنا محال ہے۔" کومل کی امی کو واقعی اچنبھا ہوا۔
"وہ تم ہم ایسے ہی کرتے ہیں ورنہ ہمیں کیا نہیں آتا۔" کومل نے بصد افتخار بتایا۔
وہ جب سے گاؤں سے آئی تھیں۔ سب ہی اپنے اپنے گھروں میں اپنے کارنامے سنا رہی تھیں۔
"سنا ہے تم گاؤں میں ہل چلا کر آ رہی ہو۔" ارسلان نے اندر داخل ہو کر کومل کو چھیڑا۔
"خیر۔ ایسا بھی نہیں ہے۔" کومل نے سخت برا مان کر کہا یہاں کوئی ان کے کارناموں کو گھاس نہیں ڈال رہا تھا۔
"نہیں' تمہارا انداز تو کچھ اسی قسم کا ہے۔" ارسلان نے تمسخرانہ نگاہ ڈال کر کہا۔
"بس رہنے دیں بھائی جان۔" اس مرتبہ سنبل نے لب کشائی کی۔
"ارے واہ' ویسے تم بڑی خاموش ہو۔ شاید تمہیں جھوٹ بولنے کی پریکٹس نہیں۔" وہ ہنس پڑا۔
"اچھا تو ہم جھوٹ ہانک رہے ہیں۔" کومل کا موڈ سخت بگڑ گیا تھا۔ "چاہے آپ ربنا۔ ہما ربیعہ سے پوچھ لیجیے گا۔"
"وہ کون سا حج کر کے آئی ہیں" "تم تو سب ہی ایک تھیلی کی "چٹیاں بٹیاں" ہو۔ ارسلان مکمل مذاق اڑانے کے موڈ میں تھا۔
"ارے چھوڑو۔ ارسلان۔" امی کو ارسلان کے "چٹیاں بٹیاں" کہنے پر سخت ہنسی آ گئی۔
دونوں بہنیں منہ پھلا کر باہر نکل گئیں۔

◇

ساری لڑکیوں میں صرف سیما ہی ایسی تھی۔ جس نے کوئی داستان امیر حمزہ نہیں چھیڑی تھی۔ جب کہ محمودہ بیگم ہی بیٹی سے گاہے بگاہے کوئی بات پوچھ لیتی تھیں۔
"کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی بیٹی۔۔؟"
"نہیں امی۔ بہت مزے میں وقت گزرا۔ غفور وغیرہ سارے کام کر دیتے تھے۔" اس نے الماری میں کپڑے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"امی گاؤں کتنا چھوٹا سا ہے مگر لوگ کتنے خوش رہتے ہیں۔"

"ہاں بیٹی، سیدھے سادے لوگ ہیں۔ خواہشیں، تمنائیں محدود۔ خوش کیوں نہ رہیں
گے۔" انہوں نے سوٹ کیس میں سر دیے کر سرسری سا جواب دیا۔ یہ ماں ان کی اکلوتی
تھی۔ دوستوں سہیلیوں کی طرح۔

"مگر ایک خرابی ہے، وہاں بہت چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کی شادیاں کر دیتے ہیں۔ بے چاری
بری طرح پس جاتی ہیں گھر داری میں۔"

"اپنے اپنے دستور ہیں، پہلے تو خیر لڑکیوں کی شادیاں جلد ہی کر دیتے تھے۔ یہ تو اب
ہے کہ پڑھائیوں کے چکر میں لڑکیاں آدھا حسن، آدھی جوانی کھو بیٹھتی ہیں۔"

"تو کیا امی پڑھائی اچھی چیز نہیں۔۔۔؟"

"نہیں خیر۔۔۔ اچھی چیز کیوں نہیں۔" انہوں نے پڑھی لکھی بیٹی کو معقول جواب دیا۔
"اللہ کا شکر کرو کہ تم تو پڑھ لکھ رہی ہو سب کی خوشی ہے۔"

"جی امی میں نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے گاؤں میں پیدا نہیں کیا۔ پڑھ لکھ کر
ہی دنیا کی سمجھ آتی ہے۔ آدمی بہت کچھ پہچانتا ہے۔"

اس نے ماں کی جانب دیکھے بغیر بدستور اپنے کام میں مگن رہ کر جواب دیا۔

فیروزی شلوار قمیض میں ملبوس وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ بولتی ہوئی محمو...
بیگم کو بیٹی پر ٹوٹ کر پیار آگیا۔ "خدا نظر بد سے بچائے۔ ہر بلا سے محفوظ رکھے۔" انہوں نے
دل ہی دل میں دعا دی۔

◇

کومل رات کو چھت پر گئی۔

"چھت تو میرے گھر پر بھی ہے۔ پر وہاں سا لطف کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔ اور تم ادھور...
سے آدمی۔ ادھوری باتیں کرنے والے۔ ادھوری ملاقاتوں میں ملنے والے۔ وہ کون بد نصیب
تھی۔ جو تمہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ بھلا کیا کمی ہے تم میں۔؟

خیر مجھے کیا پڑی ہے۔ سب کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ فوزیہ کو شاہ ایران چھوڑ...
ہے۔ کبھی ثریا ایران کو چھوڑ دیتی ہے۔ یہ غیر معمولی لوگ۔ جن کی رفاقتیں دوسروں...
احساس فاخر دیتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے رشک کے لمحوں سے گزرے بغیر بیزار بھی...

...ہے ہیں۔ جو کبھی سمندر میں نہ اترا اسے اس کی گہرائی کا کیا پتا۔۔۔۔۔ اور مجھے کیا پڑی
ہے جو میں فالتو سوچوں میں گھروں۔ بے کار باتیں سوچوں۔" اس نے سر جھٹکا۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ تھک گئی۔ اتنے دن ہنگاموں میں گزارنے کے بعد سخت بوریت محسوس ہو
رہی تھی۔ کل چھوٹی پھوپھو کے ہاں چلی جاؤں گی۔ ربیعہ کو اور سمیعہ کو چھوڑنے گئے تو کتنا
رو رہی تھیں پھوپھو۔ ویسے بھی کتنا عرصہ ہو گیا۔ گارڈن ٹاؤن میں ایک رات بھی نہیں
رک رہی۔ کیا پتا امی کہہ دیں کہ نہ جاؤ۔ ابھی تو آئی ہو۔ مگر۔

پتا نہیں۔ میرا دل کیوں نہیں لگ رہا۔ ہر طرف سناٹا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ اجاڑ۔
ویران۔ شاید سناٹے ماحول و نظر سے متعلق نہیں ہوتے۔ دل کی ویرانی۔ باہر کا سناٹا۔ ایک
ہی بات کے نام ہیں۔

ایسا کیوں ہے۔؟ شاید اتنے دن رونق میں جو گزارے ہیں۔

سنبل تو اسی طرح مصروف ہے اپنی پڑھائی لکھائی میں۔ پھر مجھے کیوں اس قدر بوریت
محسوس ہو رہی ہے۔

اماوس کی کالی راتیں تھیں۔ گاؤں گئی تو پورا چاند تھا۔ بعض اوقات اندر باہر ایک دم
اندھیرا ہوتا ہے۔ کبھی ہر طرف منور۔

جب دل ہنس رہا تھا تو۔ تو چاند بھی جگمگا رہا تھا۔ آسمان بھی پونم پر اترا رہا تھا۔ وہ نیچے چلی
آئی۔ نیچے ہمیشہ والی رونق تھی۔ ڈرائنگ روم میں پاپا کے دوست بیٹھے تھے۔ امی کچن میں
مصروف تھیں۔ سنبل اوندھی ٹی۔ وی کے سامنے لیٹی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں چلی آئی اور
نصابی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔

◇

چند دن گزرے کہ ہنگامے نئے انداز سے جاگ اٹھے۔ لیکن یہ ہنگامے کومل کے تایا ابا
جی عمار حسین کے ہاں تھے۔ جہاں جھٹ پٹ ہی ہما کے نکاح کی افتاد آپڑی تھی۔ ہما کومل ہی
کی ہم عمر تھی تقریباً۔

بس پھر کیا تھا۔ کہاں کے اسکول اور کیسے کالج۔ ہما کو اس کی خالہ نے مانگ لیا تھا۔ بیٹا باہر
جا رہا تھا۔ اس لئے نکاح کے بندھن میں جکڑا جا رہا تھا۔ مبادا باہر بیاہ نہ رچائے۔ جس لڑکی کی

اتنی ڈھیر ساری شرارتی کزنز و سہیلیاں ہوں اس کی جو درگت نہ بنے وہ کم ہے۔

"ارے ہما۔ باہر نہ نکلنا نور نہیں آئے گا۔ ویسے بھی تمہارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے سوائے نور کے۔" ربانے بوڑھوں کے انداز میں تنبیہہ کی۔

"ارے کون سا رخصتی ہو رہی ہے۔ دو سال لڑکی کو پردے میں بٹھاؤ گی۔ پھر تو کچھ زیادہ ہی نور آجائے گا۔ ایسا نہ ہو۔ دولہا میاں نورانی جلووں کی تاب نہ لا سکیں۔ چوکھنا دیکھ کر کہیں جائے نماز پر نہ اوندھے جائیں کہ یا اللہ یہ چیز تو جنت میں دینے کا وعدہ تھا۔" کومل نے کمال اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ لڑکیوں کے مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

"حد ہے توبہ ہے کومل۔۔۔!" مختلف آوازیں ابھریں' شیطان بھی پناہ مانگتا ہے ان لڑکیوں سے۔" کومل کی امی نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔

"جی ہاں' ایک آرہا ہے پرسوں آعوذ باللہ پڑھنے۔" سمیعہ نے حسب معمول قول کر پھینکا۔

"ہوش ٹھکانے ہیں تمہارے۔ لو بھلا ہونے والے بہنوئی کو شیطان کہہ رہی ہو۔" ا انہیں سچ مچ غصہ آگیا تھا۔

◇

ہما سے بڑے طارق دو سال سے زائد عرصے سے برسر روزگار تھے۔ سب ان کے پیچھے پڑے رہتے تھے کہ شادی کرلیں۔ اگر کوئی پسند ہے تو بتادیں۔

عین ہما کے نکاح کے ہنگاموں میں ہما سے چھوٹی بیہ نے کانوں میں صور پھونکا کہ بھائی جان نے ربیعہ کے لیے کہا ہے۔ وہ سب حیرت سے اچھل پڑیں۔

"ہوں۔۔۔ تو آخر یہ سبز آنکھوں والی لڑکی بھی کام دکھا گئی۔"

"ارے نہیں۔ اس بے چاری کو تو کچھ پتا نہیں ہے۔ وہ تو بھائی جان نے اپنے طور۔۔"

"اچھا تو طارق بھائی اتنے تیز نکلے۔"

ربیعہ نے انٹر ہی تو کیا تھا حال میں۔ تقریباً" آٹھ سال نو سال چھوٹی تھی وہ طارق سے۔

بس تو پھر۔۔۔ اب ربیعہ بھی تماشا تھی۔ اس بے چاری کا الگ برا حال ہو گیا تھا۔ جہاں گانا گانے بیٹھتیں طارق کو بھی بلا لاتیں۔

"طارق بھائی۔ چلیے بتائیے۔ کون سا گانا گائیں۔"

ہو بھی سناؤ سن لیں گے۔" وہ شان بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرماتے۔ ربیعہ ایک دم حواس باختہ سی ہو جاتی۔ انہوں نے خوب بے سرے گانے چھیڑ دیے۔ تب ربیعہ باہر چلی گئی۔ کومل نے جھجتی ہنسی والے چہرے کو دیکھا۔ ان کی نگاہ کا چور ڈھٹائی سے پکڑ کر گانا چھیڑ دیا۔

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
مانا کہ محفل جواں ہے حسیں ہے

چھٹانک بھری لڑکیوں نے بے چارے طارق کو زچ کر دیا۔

"توبہ توبہ جس کے پلے پڑو گی۔ وہ سر پکڑ کر روئے گا۔"

"خدا نہ کرے کہ ہم سب کسی ایک کے پلے پڑیں۔ کیا کسی شیخ نے آپ کو ورغلا دیا ہے۔ خیر آپ کی چھانٹی کی تو ہم داد دیتے ہیں۔"

کومل نے ان کی زبان کی چوک پر واویلا مچایا۔

اور طارق کو تسلیم کرنا پڑا کہ ذہانت و حاضر جوابی خان نواز حسین کے گھر کی بلکہ خاندان کی لونڈی ہے۔ محض ان ہی کا حصہ نہیں ہے۔

رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔

◇

دن گزرتے رہے۔ آخر کار وہ فائنل فرسٹ ڈویژن سے پاس کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

اسی دن اس نے سیما کو خوش خبری سنائی۔

"لو بھئی سیما۔۔۔ آج ہم بھی تمہارے ہم پلہ ہو گئے۔ یعنی گریجویٹ ود آنرز (WITH HONOUR)۔"

"بہت بہت مبارک ہو بھئی۔" سیما نے واقعی بہت مسرت سے مبارک باد دی۔

"اب کیا ارادے ہیں۔۔۔؟"

"کافی نیک ہیں۔ تمہاری طرح شادی وادی کا تو ہرگز نہیں۔"

"میری طرح۔۔۔۔۔۔ کیا مطلب۔۔؟" سیما حیران ہوئی۔

"بھئی' تم نے تو اس ڈر سے ایم۔ اے میں داخلہ نہیں لیا تھا کہ کہیں کوئی اچھا سا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے کہ لوگ زیادہ انتظار نہیں کر سکتے۔"

"اچھا ۔۔۔۔ اب تم بکواس پر اتر آئی ہو۔" سیما نے دوسری طرف دانت پیسے۔ "ایسی کوئی خرافات میرے ذہن میں نہیں ہے۔ بس ایسے ہی آرام کا موڈ تھا۔ بہت پڑھ لیا۔"

"خدانخواستہ تمہاری ریڑھ کی ہڈی تو کہیں۔۔۔" کومل نے مصنوعی تشویش ظاہر کی۔

"جی نہیں۔ میری تو ساری ہڈیاں کافی مضبوط ہیں۔ ہاتھوں کی بھی۔ ابھی آ رہی ہوں آزمانے تم پر۔" اور کومل نے خوبصورت قہقہے کے ساتھ فون رکھ دیا۔

◇

پنجاب یونیورسٹی کی پروقار عمارت میں قدم رکھتے ہوئے اس کا دل ذرا سا دھڑکا۔ ڈھیروں پراعتماد ذی نفوس کے درمیان اس نے خود کو لمحہ بھر کو "کم اعتماد" محسوس کیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی وہ نارمل تھی۔

وہ وقت سے کافی پہلے پہنچ گئی تھی۔ کلاس میں انتشار سا تھا۔ انگلش ڈپارٹمنٹ کم اور چاند رات کا بازار زیادہ لگ رہا تھا۔ ڈپارٹمنٹ میں لڑکیوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی یا شاید آئی نہیں تھیں۔

پیازی شلوار سوٹ میں پیاری سی لڑکی کو بعض نوجوانوں نے ازحد پرشوق نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر انتشار میں تیزی آ گئی۔ لوگ تیزی سے سیٹوں کی طرف بڑھے۔ لمحے بھر کو ایک دم سناٹا چھا گیا۔ کومل نے نہایت حیرانی سے اپنے استاد کو دیکھا۔

"اوہ۔۔۔ شاہدہ کا بھائی۔۔! نہیں نہیں، وہ تو کراچی میں پڑھاتا ہے۔۔۔ یہ۔۔۔ سر اس سے ملتے جلتے ہیں۔"

دو چار لوگوں کے بعد وہ اپنا نام لکھوانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کومل سر۔!"

"پورا نام۔۔؟" انہوں نے سر جھکائے جھکائے شستہ انگریزی میں پوچھا۔

اور کومل کے وجود میں ان کی آواز واضح پہچان بن کر سرایت کر گئی۔

"کومل حماد حسین خان۔ آئی مین۔ سر حماد حسین خان از مائی فادرز نیم۔"

اس بار سر نے اپنی نظریں لحظہ بھر کو اٹھائیں۔

"یس۔ نیکسٹ"

تب وہ پسینہ پونچھتی بیٹھ گئی۔

تب سر نے فراغت کے بعد اپنے لیکچر سے متعلق ضمنی گفتگو کی۔ تب اس نے محسوس کیا کہ اس سے پہلے بھی یہ کلاس لے چکے ہیں۔ کیونکہ نہ انہوں نے اپنا تعارف کرایا تھا نہ کوئی نصاب سے متعلق تفصیلی بات کی تھی۔ اس شبہ کو اس کی ہم جماعت نے یقین میں بدل دیا۔ اس نے بتایا تھا۔ سر دارا شکوہ آج دوسری بار آئے تھے۔

دارا شکوہ۔ ایک دیہاتی آدمی کا نام' ایسا حلق میں اٹکنے والا نام۔ شاید ماں باپ نے عبدالشکور رکھا ہو اور انہوں نے مارے کامپلیکس کے دارا شکوہ رکھ لیا ہو۔ کومل اپنی بے ساختگی سے باز نہ رہ سکی اور منٹوں میں ہی سب سے بے تکلف ہو چکی تھی۔ ویسے بھی اس کی شخصیت بے حد پیاری تھی۔ بناوٹ سے پاک۔ برجستہ جملہ بازی تو اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔

پاپا نے اس سے کہا تھا وہ اسے پک کر لیں گے۔ وہ باہر کھڑی ہو کر پاپا کا انتظار کرنے لگی۔ سامنے وائٹ مزدا کھڑی تھی۔ وہ بے نیازی سے فرنٹ ڈور سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔۔!" اس کے سامنے سر دارا شکوہ کھڑے تھے۔ وہ خجل سی ہو کر ایک طرف ہو گئی۔ تب وہ اندر بیٹھ گئے۔ اور زن سے گاڑی لے اڑے۔

اس نے ان کا اس قدر۔۔۔ نوٹس لیا تھا۔ اور انہوں نے تو شاید گزشتہ دنوں کی تھوڑی بہت صاحب سلامت یکسر بھلا دی تھی۔ یا واقعی بھول گئے تھے۔

نہ جانے کیوں اس نے اتنی سی بات کو اپنی انسلٹ سمجھ لیا تھا۔ اسے بے حد توہین سی محسوس ہوئی تھی۔

"ہونہہ۔ کچے گھروں کے رہنے والے نام دارا شکوہ۔ یہ تو ایسے ہوا کہ آنکھ سے اندھے نام نین سکھ۔"

◇

راستے میں اس نے پاپا کو بتایا تھا۔

"پاپا! وہ جو دادا ابا کے بائیں طرف گھر ہے نا اس میں میں نے ایک آدمی کو دیکھا تھا۔ و
رات کو اپنی چھت پر بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا اس کی بہن نے بتایا تھا کہ وہ کراچی میں رہتا ہے
پاپا! اس کا ایک بیٹا بھی تھا چھوٹا سا۔ آج ہمارے ایک سر آئے۔ سچ۔ بالکل اس آدمی
ملتے ہیں۔ اگر مجھے یہ پتا نہ ہوتا کہ وہ کراچی میں رہتا ہے تو میں بالکل یہی سمجھ لیتی کہ شا

بھائی ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہی ہوں۔ لہٰذا تمہیں ذرا احترام سے نام لینا چاہیے" پاپا نے اس کی طرح بات کے جواب میں مختصرا" کہا۔

وہ جبرا" خاموش ہو رہی۔ مگر گھر آکر اس سے رہا نہ گیا۔ شام کو جب سو کر اٹھی تو سب سے پہلے سیما کو رنگ کیا۔

"ارے سیما۔ کمال ہو گیا۔"

"مجھے پتا ہے تمہارا شعور ابھی بہت ناپختہ ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر حیران ہوتی ہو۔" سیما نے نہایت اطمینان سے اس کا نفسیاتی تجزیہ کیا۔

"سیما۔ وہ گاؤں والا دیپک پراشر ہے ناں۔ ارے وہی دادا ابا کے گھر کے برابر والا۔ ہمارے سر بالکل اس سے ملتے ہیں۔ آواز چال چلن۔"

"غالبا" تم چال ڈھال کہنا چاہ رہی ہو۔" سیما نے درمیان میں بات کاٹی۔

"ہاں ہاں وہی۔ جی۔ چال ڈھال، شکل ایک دم وہی۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ دونوں بچپن میں بچھڑے ہوئے ہم شکل بھائی ہیں۔"

"اسی لئے کہتی ہوں فلمیں کم دیکھا کرو۔" سیما نے پھر بات کاٹی۔

"تم دیکھتیں تو حیران رہ جاتیں۔" اس نے پھر گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔

"کون سی فلم؟"

"ارے فلم نہیں۔۔ سر۔۔۔ ہمارے لیکچرر یعنی پروفیسر۔" سیما کے ہنسنے پر اسے تاؤ آگیا۔

"اچھا۔۔ اچھا۔۔ پھر؟۔ میرا خیال ہے وہی ہوں گے۔"

"مگر وہ تو کراچی۔۔"

"تو کراچی مریخ پر تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے۔ یہاں جاب کر لی ہو۔" سیما نے ذرا سنجیدگی سے بات کی۔

"ارے ہاں۔ یہ تو خیال ہی نہیں آیا۔ لیکن اگر وہ شاہدہ کے بھائی ہوتے تو مجھے پہچان نہ لیتے۔ انہوں نے تو کوئی نوٹس نہیں لیا۔"

"پہچان بھی جائیں بلکہ گئے ہوں تو بھلا تم سے کیا بات کریں گے۔ کیا گاؤں میں ان سے

تمہاری دوستی ہو گئی تھی؟"

"خیر۔ دوستی تو نہیں ہوئی تھی۔ سلام دعا تو ہوئی تھی نا۔"

"سلام کس نے کیا تھا؟ دعا کس نے دی تھی؟" سیما شرارتا" بولی تب وہ اس کا مذاق سمجھ کر ہنس پڑی۔

◇

اتنی گئی گزری تو وہ بھی نہ تھی کہ زبردستی اپنی پہچان کراتی پھرتی۔ وہ بھی خاموشی سے کلاس میں بیٹھی ان کا لیکچر سنتی رہتی۔ کبھی بھی ان کی سمت یا ان کی آنکھوں میں نہ دیکھتی یہاں تک کہ اس کی بے اعتنائی دیکھ کر بعض اوقات انہیں پوچھنا پڑ جاتا کہ ۔۔۔ مس۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں۔؟

تب وہ دھیمی آواز میں کہہ دیتی۔ "میں سمجھ رہی سر!"

"ایس۔ وین آئی واز سے انگ ویٹ۔" وہ بغیر کسی وقفے کے اپنا "استادی کلام" جاری رکھتے۔

وہ اس کے لئے اجنبی تھے۔ تو وہ ان کے لئے اجنبی تر۔

جب سے یونینز ٹوٹی تھیں طلباء و طالبات کی مصروفیات میں بہت کمی آگئی تھی۔ لہٰذا وہ کبھی کبھار کوئی نہ کوئی فنکشن برپا کر لیتے تھے۔۔ فائنل والوں سے ان کی گفت و شنید ہوئی اور فنکشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ وہ اسی سلسلے میں بھاگی دوڑی پھر رہی تھی۔

"چغتائی۔۔ اے چغتائی۔ وہ تم کل میرا "پارکر ۲۵" لے گئے تھے۔"

"اے چغتائی۔ سنو میرا پین دے دو۔ مجھے نوٹس بنانا ہیں۔" وہ اوپر سے جھانک کر نیچے کھڑے چغتائی کو آوازیں دے رہی تھی۔

"بی بی! اس قدر شور مچانے سے بہتر ہے آپ اپنا مدعا نیچے جا کر ہی بیان کر والیں۔"

اس نے چونک کر دیکھا۔ دو تین طالب علموں کے ہمراہ سردار اشکوہ کھڑے تھے۔ ساتھی طالب علموں کے سامنے اسے اپنی سخت توہین محسوس ہوئی۔

"انہیں کیا حق ہے کہ راستے میں جھاڑ پلاتے پھریں۔" اس کا خون ہی کھول اٹھا۔

صبح ہی سے آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ وہ لائبریری سے نکلی تو شام کے پانچ بج چکے

تھے۔ اس نے ساڑھے چار بجے کا کہا تھا ارسلان بھائی سے۔ گاڑی کا دور دور نام و نشان نہ تھا۔ اس پر مستزاد کہ بوندا باندی تیز ہو گئی تھی۔ ارد گرد کی ساری عمارتیں بھیگ کر ایک دم سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ گیٹ سے کچھ فاصلے پر ہراساں سی کھڑی تھی۔

"کیا آپ کو کوئی پرابلم ہے؟"۔۔۔ دارا شکوہ کو دیکھ کر اس کا موڈ کچھ اور بھی آف ہو گیا۔

"میرے بھائی آتے ہی ہوں گے۔" اس نے لہجے پر قابو پا کر جواب دیا اور منہ موڑ لیا۔

"غالباً" آپ تو مسلم ٹاؤن میں رہائش رکھتی ہیں۔ کوئی نہ آیا تو مسئلہ ہو جائے گا۔"

ایسی تو کوئی بات نہیں کہ گھر والے مجھ سے یکسر غافل ہو جائیں۔"

اسے خود پر جبر کر کے جواب دینا پڑ رہا تھا۔ اسی دم لاہور کی مخصوص آندھی طوفان میں گھری بارش تیز ہو گئی۔

"میں نے آپ کی تکلیف کے خیال سے کہا تھا۔" وہ خاموش رہی۔

"دیکھئے موسم خطرناک ہے۔ باقی آپ کی مرضی۔"

وہ خود وقت کی سنگینی کا احساس کر چکی تھی 'خاموشی سے ان کے پیچھے ہولی۔

انہوں نے دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ فائل سینے سے لگائے خاموشی سے بیٹھ گئی۔ وہ دوسری طرف سے آکر بیٹھے اور گاڑی بڑھادی۔

"آپ سے میری استاد شاگردی کا رشتہ نہیں بلکہ آپ کے آباؤاجداد سے پڑوسانہ مراسم بھی مجھے آپ کی مدد کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ مراسم پہلے سے نہیں ہیں۔"

تو گویا یہ شاہدہ کے بھائی ہی نکلے اور یہ مجھے پہچانتے بھی ہیں اس نے سوچا۔

"میرا گھر راستے میں پڑتا ہے۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنے بیٹے کو دیکھ چلوں۔ اس کی آیا آج کل بیمار ہے۔۔؟" انہوں نے سامنے دیکھتے ہوئے بڑی متانت سے پوچھا۔

"جی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے ان کے سمت بڑی تفصیل سے دیکھا۔

براؤن سوٹ' سفید شرٹ' براؤن جوتے میچنگ ٹائی پن اور کف لنکس۔ وہ نک سک سے درست مکمل طور پر ایک شہری۔ ماڈرن مرد تھے۔ کسی انداز سے ان میں دیہات کی

جھلک نہیں تھی۔

"تعلیم انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔" اس نے قائل ہو کر سوچا۔ "یہ مثالیں تو میرے اپنے گھر میں موجود ہیں۔ میرے دادا معمولی پڑھے لکھے تھے۔ مگر میرے پاپا میرے تایا چچا جو اپنا اسٹینڈرڈ مینٹین کر چکے ہیں۔ اس میں قطعی ان کے ماضی کی جھلک نہیں ملتی۔"

گاڑی رک چکی تھی۔

"سر۔ میں۔ میں بھی گڈو سے مل لوں۔؟" اس کے لہجے میں شناسائی اور اپنائیت سر اٹھا کر بول رہی تھیں۔

"اچھا۔ تو آپ کو میرے بیٹے کا نام بھی یاد ہے۔" ان کے لہجے میں پہلی مرتبہ رواداری کا انداز جھلکا۔

"مجھے آپ کا بیٹا آپ سمیت اچھی طرح یاد ہے۔" اس نے بے تاثر آواز میں بتایا۔ گڈو سامنے شیڈ میں کھڑا غالباً" اپنے باپ کی راہ دیکھ رہا تھا۔ فوراً" لپکتا بھاگتا آیا۔

"ابو۔ آج بہت دیر کر دی؟" وہ بسور کر بولا۔ انہوں نے نیچے جھک کر اس کا رخسار چوم لیا۔

"بس بیٹا! کام زیادہ تھا۔ آپ نے کھانا کھا لیا تھا؟ اور بیٹے یہ جو آپ کی آنٹی ہیں نا انہیں آپ نے ابھی تک سلام نہیں کیا؟"

گڈو نے اسے بغور دیکھ کر بڑے پیارے انداز میں سلام کیا۔

"ابو یہ آنٹی۔ دادا ابا کے گھر میں بھی تھیں۔ ہیں ناں۔"

بچہ انتہائی ذہین تھا۔ اسے ٹوٹ کر پیار آگیا۔

"بیٹے۔! ہم آپ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ آپ کی آنٹی کو گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ شام ہو گئی ہے نا اور بارش بھی تیز ہے۔" ان کا انداز اس سے یکسر مختلف تھا۔ جو وہ یونیورسٹی میں اپنائے ہوئے تھے۔ وہ مکمل طور پر ایک باپ نظر آ رہے تھے۔ بچے میں محو۔

"آنٹی کو ڈر لگتا ہے؟"

"شاید۔ اچھا آپ مت ڈریئے گا۔ بوا کہاں ہیں؟"

"وہ کچن میں ہیں۔ ابو! آنٹی کو اندر لائیے۔ چائے نہیں پلائیں گے کیا؟ آپ تو سب کو چائے پلاتے ہیں۔" گڈو کا لہجہ معصومیت سے پر تھا۔

"کیا خیال ہے آپ کا۔؟" وہ اس کی جانب پلٹے۔

"نہیں سر شکریہ۔ دیر بہت ہو گئی ہے۔" وہ گھبرا سی گئی۔

وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے پھر گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔

وہ کافی دیر خاموشی سے گاڑی چلاتے رہے۔

"مس کومل، آپ نے میری آج کی بات کا کافی برا مانا تھا۔ ایک استاد کی حیثیت سے میں اپنے شاگردوں پر اپنا کچھ حق سمجھتا ہوں شاید آپ کو احساس نہیں کہ آپ کی آواز کافی بلند تھی۔ اور ساتھ کے ڈپارٹمنٹ میں ڈاکٹر بخاری تھے۔ آپ ان کے لیکچر، ان کی شخصیت سے اچھی طرح واقف ہوں گی۔ وہ میونخ اور آکسفورڈ تک میں لیکچر کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ ماحول کا انتشار یکسوئی کو متاثر کرتا ہے۔ میرا مقصد آپ کی انسلٹ نہیں تھا۔"

"میں نادم ہوں سر۔" وہ ساری کدورتیں بھلا کر ایک دم اچھی بچی بن گئی۔

"دراصل کومل۔۔ میرا مطلب ہے مس کومل۔ انسان بنا وقار اپنی کوئی شخصیت نہیں رکھتا۔ دوسروں کے حفظ مراتب کا دھیان دراصل اپنے ہی وقار کا تحفظ ہے، عمر سے ہر آدمی میں وقار آہی جاتا ہے۔ لیکن جانے کیوں مجھے باوقار نوجوان پسند ہیں، بلا تفریق لڑکے و لڑکی کے۔

اور پھر یونیورسٹی اعلیٰ ترین تعلیمی ادارہ ہوتا ہے، یہاں طالب علم کو اس کے شایان شان نظر آنا چاہیے۔ میرا خیال ہے آپ بور ہو گئی ہیں۔؟" وہ بولتے بولتے لائن بدل گئے۔

وہ جوان کی شفیق آواز کے سحر میں کھو گئی تھی، چونک پڑی۔

"نہیں سر، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" (کیسا اچھا بولتے ہیں آپ) "آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہ ہو گی سر۔" وہ ان کی طرف دیکھ کر بولی وہ بدستور سامنے دیکھ رہے تھے۔ ونڈ اسکرین پر وائپرز اور بوندوں کا رقص جاری تھا۔

"شکایت تو مجھے اب بھی آپ سے کوئی نہیں۔" وہ شفقت سے مسکرائے۔

"سر! بائیں طرف موڑ لیں۔ وہ تیسرا بلاک سر۔ جی۔ بس۔ سر! آپ کو میری وجہ سے بہت پریشانی اٹھانا پڑی۔ یقین کیجیے میں بہت شرمندہ ہوں۔ پلیز اندر آیئے نا۔"

"پھر کبھی سہی۔ آپ نے خود دیکھ لیا۔ گھر پر میرا بیٹا میرا منتظر ہے۔"

"شکریہ سر۔ بہت بہت شکریہ۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

◇

"ایمان سے سیما۔ جان پانی ہونے لگتی ہے ان کے سامنے۔ اتنے بڑے لڑکے لڑکیوں سے اس طرح ڈیل کرتے ہیں۔ جیسے سب کے ابا جان ہوں۔ اور سیما وہ دن گئے۔ جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے۔ یعنی ہم ان پر چھت پر سے جملے پھینکا کرتے تھے۔ اب تو مجھے سوچ سوچ کر شرم آتی ہے۔ کیا گلوری۔ کیا گریس ہے ان کی شخصیت میں۔ مجھ سے تو ان کے سامنے بولا ہی نہیں جاتا۔"

سیما آئی ہوئی تھی۔ اور کافی دیر سے کومل کے سر کی گزشتہ ہجو اور حالیہ قصیدے میں توازن قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر قصیدے کا پلڑا زمین سے جا لگا تھا۔

"تم نے کہا نہیں اپنے گھر آنے کے لئے۔ آخر وہ ماموں جان کو جانتے ہیں۔" سیما نے اسے بغور دیکھ کر کہا۔

"کہا تھا۔ جس دن مجھے چھوڑنے آئے تھے۔"

"آئے تھے پھر اندر۔؟"

"نہیں۔ ان کا رویہ ایسا ہوتا ہے کہ اصرار و صرار فضول لگتا ہے انہوں نے منع کر دیا۔ پھر میں نے کہا ہی نہیں۔" اس نے سچائی سے سب بات بتا دی۔

"ارے وہ تو مجھے شروع دن میں سے پہچانتے ہیں۔ میں سمجھی بھول بھال گئے۔ تمہیں بھی دیکھا تھا۔ تمہیں بھی پہچان جائیں گے۔ وہ تاں!"

"نہیں بھئی۔ مجھے تو صرف دیکھا تھا۔ دعا سلام تو تم سے ہی تھی۔" سیما نے ہنس کر ا[illegible] چھیڑا۔

"مگر بے چارے مسائل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اپنے بیٹے سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"خیر تو ہے، آج تم اپنے سر کی ہی باتیں کیے جاؤ گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ۔"

"تو نہیں تیرا ذکر ہی سہی"

"ارے نہیں۔ توبہ۔ ان کے متعلق ایسا سوچنا بھی مت۔"

"اور تمہارے متعلق۔۔؟" سیما نے پھر اسے چھیڑ کر کوئی بھید لینا چاہا۔

"نہیں یسرا۔ اتنی چھوٹی باتوں میں اتنے بڑے انسان کو نہ لاؤ۔" وہ ازحد سنجیدہ تھی۔ یسرا
حیران رہ گئی۔

◇

تین دن ہو گئے تھے۔ سر یونیورسٹی نہیں آئے تھے۔ تب وہ جلد ہی یونیورسٹی سے چلی آئی۔ بعض اوقات انسان صرف دل کے احکامات سنتا ہے۔

ایک بوڑھی سی عورت اسے برآمدے ہی میں ٹکرا گئیں۔

"اماں۔۔ سر یہیں گھر پر' میرا مطلب ہے آپ کے صاحب؟"

"ہاں پتر' میرے نال آجاؤ۔ انا واجی چنگا نئیں اے" (ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے)

"اے جھوڑا اے کمرہ ایدھر چلے جاؤ۔ پر ناں۔ ٹھہرو۔ ہلاں۔ میں پچھ لواں (پوچھ لوں) ناں کی اے تہاڈا پتر۔؟" (نام کیا ہے تمہارا۔)

"جی۔ کومل۔۔"

بڑی بی اندر چلی گئیں۔ پھر جلد ہی دروازے پر نمودار ہو کر بولیں۔

"آجاؤ بی بی۔۔!"

تب وہ جھجکتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ وہائٹ بیڈ شیٹ والے وسیع بیڈ پر سرخ کمبل اوڑھے سر نیم دراز تھے۔

"السلام علیکم سر۔؟"

"وعلیکم السلام۔۔۔!" نہ وہ حیران ہوئے۔ نہ کچھ استفسار کیا ہاں صرف اس کا حال پوچھا۔

"کیسی ہیں بی بی آپ۔۔۔؟"

"سر! میں تو آپ کا حال پوچھنے آئی ہوں۔" وہ بچوں جیسی خجل سی مسکراہٹ سجا کر بولی۔۔ "ویسے کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"ایسے ہی موسم کا اثر ہے۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔"

"وہ جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔" ویسے سر۔ مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کچھ خیال نہ کریں۔" وہ صاف گوئی سے گویا ہوئی تھی۔

"ارے نہیں مس کومل آج کل تو ویسے بھی بیمار کی عیادت کرنا ایٹی کیٹس میں شامل

"لیکن سر! میں نے یہ سب ایٹی کیٹس کے تحت نہیں کیا میرا دل چاہا تھا۔"

"بہت اچھا دل ہے آپ کا۔" وہ سادگی سے مسکرائے۔

اسی دم بوا ٹرالی سمیت اندر داخل ہوئیں۔ اسے آئے ہوئے بس ہی منٹ ہوئے تھے۔

"ارے اماں۔ یہ آپ نے کیا تکلیف کی؟"

"بس۔ سر۔ میں چائے نہیں پیوں گی۔"

"کیوں بھئی۔ یہ تو عام سی چیز ہے۔"

"سر! مجھے شرم آتی ہے۔ آپ کے گھر میں' آپ کے سامنے اس طرح چائے پیتے ہوئے۔"

"بوا! انہیں ڈرائنگ روم میں لے جاؤ۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے سر۔ میں نے کبھی اپنے کسی استاد کے ہاں چائے نہیں پی۔"

"ارے بھئی۔ کیا چھوٹی چھوٹی باتوں کو مسئلہ بناتی ہیں۔ آپ نے تو ابھی بہت بڑے بڑے کام کرنے ہیں لے لیجئے۔ شاباش اور ایک کپ مجھے بھی بنا کر دیجئے۔ آپ تو بہت اچھی بچی ہیں۔" تب وہ بے بس سی ہو گئی۔

وہ انہیں چائے کا کپ تھمانے ان کے قریب گئی تو ان کی گود میں ایک تازہ ترین انگلش ناول تھا۔ پرسوں ہی لائبریری میں آیا تھا۔

"سر! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات کہوں؟"

"جی ضرور۔" وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"سر اس کی چھپائی بہت باریک ہے۔ آپ کی طبیعت بھی خراب ہے۔ ذہنی تھکن پہلے کیا کم ہے۔ اتنی باریک چھپی ہوئی کتاب آپ کے ذہن پر اور بوجھ ڈالے گی۔"

انہوں نے پہلی مرتبہ اس کی سمت غور سے دیکھا۔ "ذہنی تھکن" کہنے کا انداز کچھ عجیب سا لگا تھا۔ ہمدردی بھی نہیں تھی۔ ترس بھی نہیں تھا۔ ترحم بھی نہیں تھا۔

"میری ذہنی تھکن' یہ میرے دل سے گزر کر اب ذہنی دروازوں میں براجمان ہے۔ میں کھوکھلا نہیں ہوں۔ میرے اعصاب فولادی ہیں۔ یہ بچوں جیسی باتیں کرنے والی لڑکی میری آگہی کے دروازوں پر چوکیداری کرنے لگی ہے۔ کیا یہ واقعی اتنی حساس و گہری

میں کچھ کروں۔ کچھ ظاہر کروں۔ یہ میرے اصل میں جھانکنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ نہیں نہ
میرا وہم ہے۔ یہ کھلنڈری معصوم سی لڑکی ہے۔"

"ہلڈو نہیں آیا ابھی تک۔ وہ آپ سے بہت باتیں کرتا۔" انہوں نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

"جی۔ محراب میں چلتی ہوں۔ دیر ہو جائے گی۔"

"اچھا سر۔ خدا حافظ۔"

"کومل۔ تمہیں اس طرح خیریتیں دریافت کرنے کے لئے نہیں جانا چاہیے۔"

◇

ماموں۔ ممانی کو تو کم از کم بتا دیا کرو۔"

جس دن بھی کوئی خاص بات ہو جاتی وہ بتانے پہنچ جاتی۔ بقول چھوٹی خالہ ہلکے پیٹ کی ہو تو دیا تھا۔ اب سیما کا درس بھی سننا پڑ رہا تھا۔

"ارے یہ تو اتفاق تھا۔ راستے ہی میں پڑتا ہے ان کا گھر مجھے ایسے غیر معمولی لوگوں سے مل کر عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔ دکھ جن کے روم روم میں پلتے ہیں اور یہ لوگ مگر اسی طرح ہنستے مسکراتے ہیں۔ اپنی زندگی کو کسی حادثے کا محتاج نہیں بناتے۔ ایسا لگتا ہے۔ دکھ اور حادثے ان سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے ہوں۔ مجھے امپریس کرتے ہیں۔ ایسے فولادی اعصاب رکھنے والے لوگ کہ کوئی حادثہ ان کے مقاصد' ان کے معمول پر اثر انداز نہیں ہوتا۔"

"دکھ ٹٹولتے ٹٹولتے کہیں دکھ بانٹنے نہ بیٹھ جانا۔" سیما نے ایک گہرا مذاق کیا۔

"کیا حرج ہے۔" وہ بھی مسکرا کر بولی۔

"تمہارا مطلب ہے؟" سیما نے اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"ارے۔ میں تو مذاق کر رہی ہوں۔ ان کے سامنے تو عام سی بات کرنا کٹھن مرحلہ ہے۔ اس قسم کی بات کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ بلکہ تمہاری جگہ کوئی اور اگر یہ بات کہتا تو میں بہت برا مانتی۔ پر مجھے پتا ہے کہ تم مجھے اچھی طرح سمجھتی ہو۔"

سیما اپنے بارے میں اس کا خیال جان کر دل ہی دل میں بہت شرمندہ سی ہوئی۔

گی۔ تیرے سر جیسے بھی کم ہی ہوتے ہیں۔ اور تجھ جیسے بھی صاف سادہ سچے اور محبت

"سیما میں نے اکثر سوچا ہے۔ آخر وہ کون پتھر دل عورت تھی کہ جو سر کی قدر نہ کر سکی۔ اپنے بچے کو چھوڑ کر چلتی بنی۔"

"توبہ ہے کومل۔ سر۔ سر۔ کوئی دوسری بات تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"سیما۔ تم کیوں اس قدر چڑتی ہو ان سے؟"

"بھئی مجھے کیا کہ چڑتی پھروں۔ مجھے تو تمہیں دیکھ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔"

"ایسا ہو گیا ہے مجھے۔؟ بھئی اور دوست میں نے بنائے نہیں یونیورسٹی میں۔ سر سے ہی بات چیت ہو جاتی ہے۔ وہ میں تمہیں بتا دیتی ہوں۔ مجھے تو اب ویسے بھی پڑھائی سے فرصت نہیں ملتی۔ انگلش میں ایم۔ اے کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے انگلش میری ذرا کمزور رہی ہے۔"

سیما کی بات چیت تو کافی عرصے سے چل رہی تھی۔ اب اچانک ہی شادی کا مرحلہ آ گیا تھا۔ کومل تو سب بھول بھال کر شادی کے انتظامات میں لگ گئی۔ بیس دن پہلے ہی پھوپھو کے ہاں جا پہنچی تھی۔ کپڑوں و زیورات کی شاپنگ' جوڑوں کی ٹکائی' شادی میں پہننے کے لئے اپنے ملبوسات کی تیاری۔ یونیورسٹی بھی نہیں جا رہی تھی۔

"سیما۔ عطا بھائی نے تو تمہیں بتایا ہو گا ہنی مون کہاں منائیں گے۔"

"ارے۔۔۔ میں کب ان سے ملی ہوں جو آنے والے دنوں کے پروگرام مرتب کرتے۔"

"دیکھو' اگر باہر نہ جا سکو تو چترال چلی جانا۔"

"وہاں کیا ہے۔؟"

"کیا ہے۔؟ ارے قدرتی حسن ہے۔ سادگی ہے۔ خوبصورت لڑکیاں ہیں۔"

"باقی تو سب ٹھیک۔ مگر یہ خوبصورت لڑکیاں۔؟"

"بھئی۔ علی بھائی' عمر بھائی' ارسلان بھائی۔ آخر کب تک اس طرح رہیں گے۔ ان کے لئے پسند کر لینا۔"

"چترالی لڑکیاں۔؟" سیما نے جھلا کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ بھئی انہیں تو کوئی پسند نہیں آتی۔ آخر ہم بہنوں کا بھی کچھ فرض ہے۔"

"اگر سن لیا نا ان لوگوں نے تو کہیں تمہیں ہی کسی نسواری پٹھان کے پلّے نہ باندھ دیں۔"

"خیر۔ انہیں یہ تاب' یہ مجال یہ طاقت کہاں۔ مگر بھئی میرا خیال ہے۔ بھابیاں خوبصورت ہونی چاہئیں۔ ایک طرح کا ڈیکوریشن پیس ہوتی ہیں گھر میں؟"

"تمہاری تو ذہنی رو بہک جاتی ہے منٹ میں۔" سیما واقعی چڑ گئی۔

"ارسلان بھائی' دیکھیں یہ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"ہوں' کیا کہہ رہی ہیں محترمہ؟"

"آپ کی شادی کرا رہی ہیں۔"

"ایسی اہم باتوں کا خیال تم لوگوں کو دیر ہی میں آتا ہے۔"

"یہ تو پوچھ لیں بھابی کسے بنا رہی ہیں۔؟"

"کسے بنا رہی ہیں محترمہ؟" وہ بھی شرارت کے موڈ میں تھا۔

"کسی چترالی حسینہ کو۔"

"کیا آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ ہے۔؟"

"لو سن لو' اپنے بھائی کے خیالات۔" سیما نے کومل کو چھیڑا۔

"انہیں تو یہاں کی یونیورسٹی میں پڑھی گئی موصوفہ بھی قبول نہیں۔ ڈائریکٹ آکسفورڈ پہنچے ہیں۔"

"ان کے پہنچنے کی بھلی چلائی۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"آکسفورڈ ٹٹولنے میں بھی تیس چالیس ہزار کا بجٹ بیٹھے گا۔ کوئی چترالی قبول کر لیں گے تو چار پانچ ہزار میں چھوٹ جائیں گے۔"

"سیما! مجھے تو خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔ یہ تو واقعی سنجیدہ ہے۔"

تب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"مان لیا بہت استاد ہیں' میں تو سوچ رہی تھی۔ ان باتوں میں بہک کر اپنی پسند بتا دیں گے۔ مگر مان لیا بھئی مان لیا۔"

"چلیں خیر' اتنا تو پتہ چل گیا کہ محترمہ آکسفورڈ میں پڑھ رہی ہیں۔"

"کون۔؟" ارسلان گڑبڑا سا گیا۔

"آپ فکر نہ کریں' میں بتادوں گی امی کو۔ ہو جائے گی آپ کی مشکل آسان۔"

"کیا بتادو گی؟"

"یہی کہ بھائی جان کی پسند آکسفورڈ کے تعلیمی بیڑے میں محو سفر ہیں۔"

"ارے غضب خدا کا ارے بھئی' وہ آکسفورڈ وغیرہ میں نہیں پڑھ رہیں بلکہ وہ تو۔"

"ہاہا۔ ہاہا۔" کومل اور سیما نے تالیاں بجائیں۔

"جلدی بتایئے۔ شاباش۔ ہاں تو پھر کیا نام ہے؟"

ارسلان اپنی حماقت پر ماتھا پیٹ کر رہ گیا۔

"مجھے امید نہیں تھی کہ تم لوگ اس قدر تیز ہو۔ بتادوں گا میں خود ہی امی کو۔" وہ خجل سا وہاں سے چلا گیا۔

"ارے کومل' ایمان سے۔ بہت تیز ہو۔ اتنی تو مجھے بھی امید نہیں تھی۔"

"ارے بھئی اب میں بہت سنجیدہ ہوں۔ بھائی جان کی شادی کے سلسلے میں۔ سب کے گھروں میں شادیاں ہو رہی ہیں۔ بس ہمارا ہی گھر۔"

"تم اپنی کیوں نہیں کرا لیتیں۔؟"

"ابھی ہمارا وقت نہیں آیا۔" اس نے سر جھکا کر دھیمے سے مسکرا کر کہا۔

"اور وہ افضال والے تو بہت پیچھا لے رہے تھے۔"

"اگر وہ تو تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ کومل! اگر کوئی تمہاری قربتوں میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ تو اسے خوشی دے دینی چاہیے۔"

"سیما ہو سکتا ہے کوئی اس سے زیادہ ضرورت مند ہو۔ کوئی اس سے زیادہ ہماری ذات سے خوشی محسوس کر سکتا ہو۔"

وہ آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

تب ہی لڑکیوں کا ریلا اندر آگیا۔ سب پیلے کپڑوں میں تھیں۔ آج سیما کی مایوں کی رسم تھی۔

"مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا 'بدھ مت' کو پھر سے عروج حاصل ہو رہا ہے۔ تم نے اپنے سر کیوں نہیں منڈوائے۔" اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"تمہیں ساتھ لے کر منڈوائیں گے۔" رینا نے جل کر کہا۔

"تم نے کیوں نہیں بدلے کپڑے ابھی تک۔ سیما باجی بھی اسی طرح ہیں۔"

"ارے میں نہیں پہنوں گی یہ یونیفارم۔ ارے بھئی صرف سیما کو ہی پہننے چاہیے تھے نئے پیلے کپڑے۔ مجھے تو تم سب کی نیت میں کھوٹ نظر آرہا ہے۔ کیا سیما کے دیور وغیرہ بھی [illegible] ہیں۔ کیوں بیہ؟"

"جی نہیں۔ سب پہنتے ہیں۔ اچھا لگتا ہے۔" بینا نے منہ بنا کر کہا۔

"کیا اچھا لگتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ "بدھوؤں" کا مناظرہ شروع ہونے والا ہے۔"

"اچھا بس کریں۔ ہمیں پتا ہے آپ کی ہسٹری میں معلومات اچھی خاصی ہیں۔ جلدی کریں۔ سعیدہ خالہ کہہ رہی ہیں۔ پھر شام بہت ہو جائے گی۔" بیہ نے جلدی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد سیما کی مایوں کی رسم ادا کی گئی۔ سیما لال دوپٹہ سر پر ڈالے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جیسے ہی اسے کمرے میں لے کر جانے لگے ایک پڑوس کی بڑی بی مخصوص آواز میں منمنائیں۔ "ارے سیما سے چھوٹیوں کو اس پڑے پر بٹھا دو۔ اللہ سہرے کے پھول جلدی

◇

کھلائے گا۔"

"لو اور سنو سیما پڑی سے اتر گئی ہے تو اس کا مطلب ہے ہم سب ہی۔"

کومل بات ادھوری چھوڑ کر کھلکھلائی تو سب ہی ہنس پڑے۔

شادی کے تھکا دینے والے ہنگاموں سے فراغت پا کر اس نے کافی دنوں بعد یونیورسٹی میں قدم رکھا تھا۔ وہ کاریڈور سے گزر رہی تھی کہ سیاہ گاؤن میں ملبوس سروار اشکوہ نظر آئے۔

"السلام علیکم سر۔!"

"وعلیکم السلام۔!"

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک رہی بی بی۔ کافی دنوں بعد نظر آئیں۔"

"جی ہاں سر، طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔ میری کزن کی شادی تھی۔ اس میں مصروف رہی۔" اس نے بہت مودب ہو کر کہا۔

"اب تو پڑھائی ہو گی نا۔"

"بالکل سر۔!"

"آیئے پھر میں کلاس لینے ہی جا رہا ہوں۔"

وہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"آپ کو بہت سنجیدگی سے اسٹڈی کرنا چاہیے۔ ایک ہفتے بعد سمسٹرز شروع ہو گئے ہیں۔"

"جی سر۔!"

"شادیاں وادیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔ آپ پورے سولہ دن غیر حاضر رہیں۔"

وہ دل ہی دل میں حیران ہوئی۔ سر کیا دن گنتے رہے تھے۔ اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوا اور ایک انجانی خوشی سی۔ ساتھ اس بات کا خوف بھی کہ یہ سولہ دن کا گیپ کیسے پورا کرے گی۔

"سر"

"جی"

"آپ اگر مائنڈ نہ کریں تو ایک بات کہوں۔"

"جی ضرور کہیے۔"

"سر گزشتہ لیکچرز کے بارے میں اگر میں آپ سے مدد لوں۔۔ تو۔۔؟"

"بصد شوق۔ لیکن آپ جانتی ہیں میں چار بجے یونیورسٹی چھوڑ دیتا ہوں۔ اس دوران اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔ اگر اس دوران میری کلاسز نہ ہوئیں فائنل ہیں۔"

"سر اگر مجھے سخت پرابلم کا سامنا ہوا تو گھر آجاؤں گی۔ آپ خیال تو نہ کریں گے؟"

"جی نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ سے تو مجھے تعلق ہمسائیگی کا بھی پاس ہے۔"

وہ جانے کیا سوچ کر جھینپ کر مسکرا دی۔

پندرہ دن تک تو وہ نئے لیکچرز سے متعلق تیاری کرتی رہی اس کے بعد امی سے اجازت لے کر ارسلان کے ہمراہ ان کے گھر چلی آئی۔ ارسلان صرف ذرا دیر بیٹھا۔ یہ سوچ کر اور بھی جلدی اٹھ گیا کہ اس کا حرج ہو رہا ہے۔

ان کے بیڈ روم ہی میں انہوں نے کلاس لگائی۔

بنا کوئی فالتو بات وہ تدریس میں مشغول ہو گئے۔

دھیما دھیما۔ دل میں اترتا لہجہ۔ ہر بات اس انداز میں سمجھاتے تھے کہ بالکل آسان لگنے

تکی تھی۔

وہ کوئی سوال اٹھاتی تو اسے بالکل مطمئن کر دیتے۔ سیاہ شلوار سوٹ میں وہ کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے۔ خدا نے مکمل طور پر مردانہ حسن اور تعلیمی صلاحیت سے نوازا تھا۔ ان کی ذات میں بے پناہ گلیمر رکھتے تھے۔

جب وہ "پارٹن" اور محبت پر بات کرتے تو یہ بات اس کے قلب کو گدگدانے لگتی۔ اسے ایسا لگتا کہ دنیا کی سب سے مکمل بات سب سے حسین چیز محبت ہے۔

"سر! محبت ایک لافانی جذبہ ہے۔ فانی جذبات اور فانی انسان اس سے کس طرح انصاف کر سکتے ہیں؟"

"دیکھیے بی بی۔۔ انصاف کمال میں تو کہیں نہیں ملتا۔ رہی محبت کی بات تو یہ جذبہ دو انسانوں کے درمیان ایک پل کی طرح کام کرتا ہے۔ بی بی! محبت کرتا ہوں یا کرتی ہوں یا کرتے ہیں۔ محبت کی نہیں جاتی۔ محبت محسوس کی جاتی ہے۔ جو کی جاتی ہے وہ محبت نہیں ہوتی۔ احساس کے بغیر کوئی جذبہ مکمل نہیں۔ محبت کے جذبے کے تحت کئی احساسات اس ضمن میں آجاتے ہیں۔ محبت کے لئے "کرنا" نہیں لگاتے۔ "ہونا" لگاتے ہیں۔ جب محبت خاموشی کے پل صراط پر سفر کرکے دوسرے ذی نفس تک پہنچتی ہے تو دوسرا اس احساس کو خود بخود دل میں جذب ہوتے محسوس کرتا ہے۔ پھر جب ادھر سے سفر شروع ہوتا ہے تو انصاف "بھی شروع ہونے لگتا ہے۔ شدید عمل اور شدید رد عمل۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے۔ بے بہا عطیہ انسان اسے بیان کرنے میں انصاف نہیں کر سکتا۔ مختصرا" یوں کہہ لیجئے۔ محبت بڑی ہے اور انسان چھوٹا۔۔" وہ سحرزدہ سی ان کی حسین گفتار میں کھوئی ہوئی تھی۔

"سر! اگر کوئی کسی پر یہ ظاہر کرنا چاہے کہ اس کی محبت بہت زیادہ ہے تو اس کی شدت (CAPACITY) ظاہر کرنے کا معیار۔ پیمانہ۔؟"

"محبت ایک قیامت ہوتی ہے بی بی۔ اس قیامت کا رد عمل شدید۔ بی بی۔ اس کی شدت دوسری طرف محسوس کرلی جاتی ہیں۔ اور یہ رد عمل ہی ایک پیمانہ ہے۔" گفتگو نصاب سے خارج ہو چکی تھی۔ اس کا احساس دونوں ہی کو کافی دیر بعد ہوا۔ پھر وہ دوسرے موضوعات کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک گھنٹے بعد ارسلان لینے آ گیا تھا۔

پر نصابی باتوں کے بعد اس نے ایک دن ہمت کر کے نہایت ذاتی سوال کر ڈالا۔

"سر! آپ کا بیٹا اپنی ای کی کمی کو بہت محسوس کرتا ہو گا۔؟"

"محسوس کرنے کے لئے انسان کے پاس کیا کچھ نہیں۔"

"اگلے ہفتے میں گاؤں جا رہا ہوں۔ فیصلہ ہو جائے گا اس مرتبہ۔"

"جی سر۔؟"

"جی ہاں فیصلہ۔ یعنی میری بیوی میرے پاس آجاتی ہے یا نہیں۔ یعنی وہ میرے پاس آنے کے لئے آمادہ ہے کہ نہیں۔"

"سر! وہ کیوں آمادہ نہیں۔؟"

"ادلے بدلے کی شادی کے مسئلے ہیں۔ آپ میری بہن شاہدہ سے تو مل ہی چکی ہیں۔ شاہدہ کے شوہر نشہ کرتے ہیں۔ ایک بار اس پر قاتلانہ حملہ بھی کر چکے ہیں۔ وہ گھر آگئی تو میری بیوی کو بھی بلوا لیا گیا۔ ذہنی ہم آہنگی تو ہمیں بھی نہیں تھی۔ جس وقت مجھے خودساختہ رسموں کی سزائے موت دی گئی اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ یہ بچپن کی شادی تھی۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ میرا ایک آدرش تھا مگر اس جگہ میں بھی مجبور ہو چکا تھا۔

"میرے والدین شاہدہ کو بھیجنے پر راضی نہیں۔ یہی حال میرے ساس سسر کا ہے۔ اس مرتبہ فیصلہ ہو جائے گا۔ خدا کرے ہو جائے مجھے اپنے بچے کی بہت فکر ہے۔"

"آپ کا خیال ہے آپ کی بیگم آجائیں گی؟"

"میرا خیال ہے لوگ بسانے کی باتیں کریں گے۔ اور خدا کرے یہ معاملہ سلجھ جائے۔"

"باقی ماندہ زندگی اختلافات کے ہمراہ گزر جائے گی سر!"

"میں اسے ایک سزا سمجھ کر قبول کر چکا ہوں۔"

"سر آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا۔ میں نے آپ کی پرسنل لائف۔"

"ارے نہیں بی بی۔ میرے تمام کولیگز کو میرے بارے میں پوری طرح علم ہے۔ مجھے چھپ چھپا کر زندگی گزارنے کا انداز پسند نہیں۔ مجھ سے متعلق تمام افراد کو علم ہے۔ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ ایک غریب کسان کا بیٹا ہوں۔ یعنی سیلف میڈ آدمی ہوں۔ میرے والدین کا اصرار ہے کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ لیکن میں کوئی جذباتی قدم اٹھانا نہیں چاہتا کہ کل کو آخر میں اپنے باشعور بیٹے کے سامنے جوابدہ ہوں گا۔ کہ ماں جاہل ہو

پڑھی لکھی بچوں کو عزیز ہوتی ہے۔

آپ دعا کیجئے گا۔ میرے بیٹے کو اپنی ماں اور باپ بیک وقت حاصل رہیں۔"

"جی ضرور۔ سر۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"والدین کے خیال میں ان کے حکم سے سرتابی کر رہا ہوں۔ اس لئے وہ سزا کے طور
میرے پاس نہیں رہتے۔"

"سر! آپ کو اپنی بیگم سے بہت محبت ہے۔" اس نے ذاتیات میں مداخلت کی جسارت کر
دی۔

"شاید۔ کہ وہ میرے بچے کی ماں ہے۔" انہوں نے مبہم سا جواب دیا۔

"سر۔ آپ کو کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معاف فرمایئے گا۔"

تب وہ مسکرا دیئے۔ بولے کچھ نہیں۔!

پھر۔ سر دارا شکوہ ایک ہفتے کی رخصت پر چلے گئے۔ اور اس کا یہ ہفتہ ایک بے چینی کے
عالم میں گزرا۔ ایک ایسی بے چینی جو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اور جب ایک ہفتے کے بعد سر یونیورسٹی میں نظر آئے تو اس نے بڑی گہری نظروں سے ان
کا جائزہ لیا۔ مگر ان کے چہرے پر سوائے شفقت کے کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ خوشی کا نہ دکھ کا
اپنے معمول کی طرح مصروف تھے۔ کوئی انداز بدلا ہوا نہ تھا۔

یونیورسٹی میں سر کے ساتھ وہ بات پیدا نہیں ہو پاتی تھی جو گھر میں ہوتی تھی۔ لہٰذا اس کی
ہمت نہ پڑ سکی کچھ پوچھنے کی۔ نہ ہی ان کے گھر جا سکی۔ نہ کوئی بہانہ تھا اور نہ کوئی اتفاق
تھا۔ یوں ہی خاموشی سے ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ پھر چھٹیاں ہو گئیں۔ وہ گھر میں مصروف رہنے
لگی۔ بنا کسی کام کے اس کا حوصلہ ہی نہ ہوتا تھا کہ گھر ہو آئے۔

سر کو بھی کبھی کبھار آ جانا چاہیے آخر ہمارے گھر والے انہیں جانتے ہیں۔

اس نے رات کو یوں ہی بر سبیل تذکرہ ذکر چھیڑ دیا۔ جس پر پاپا نے سرسری انداز میں
تھا کہ ان کے والد ہماری زمینوں پر کام کرتے رہے ہیں۔

"پاپا! پھر سر آپ سے ملنے کیوں نہیں آئے کبھی؟"

"مرضی ہے بیٹی ہو سکتا ہے "کلاس ڈفرینس" کا کمپلیکس ہو۔"

"مگر پاپا سر تو خود اعتماد ہیں۔ وہ کہتے ہیں میرے والد محنت کش ہیں۔ میں ان پر شرماتا نہیں

فخر کرتا ہوں۔ اور پھر وہ خود بھی اب معزز شہری ہیں۔"

"اچھی اولاد کی یہی پہچان ہے کہ وہ والدین کی قدر کرتی ہے۔" انہوں نے بیٹی کو محبت سے
دیکھ کر کہا۔

"تو پاپا! آپ بھی کبھی ان سے مل آیا کریں۔"

"بیٹا مصروفیات کس قدر ہیں۔ تم جانتی ہو۔ بہر حال کوشش کروں گا کہ کبھی مل آیا
کروں۔ اب تو خوش۔؟"

وہ بچوں کی طرح بے ساختہ مسکرا دی۔

◇

یونیورسٹی کھل جانے پر وہ ایک دن ہمت کر کے ان کے گھر چلی آئی۔ وہ لان میں اپنے بیٹے
کے ساتھ بیٹھے تھے۔

"السلام علیکم سر۔"

"وعلیکم السلام' بہت دنوں بعد آئیں۔"

"بس سر! جان بوجھ کر نہیں آئی کہ آپ بھی سوچیں گے کہ روز روز کیوں آنے لگی
ہوں۔"

"وہم ہے آپ کا' میں غیر اہم باتیں نہیں سوچتا۔"

گڈو اسے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوا۔

"ابو۔ جب بھی آنٹی آتی ہیں میں سمجھتا ہوں امی آ گئی ہیں۔ آپ کہتے ہیں نا امی اچانک
آ جائیں گی۔ مگر ہر مرتبہ آنٹی ہوتی ہیں۔" گڈو مایوسی سے بولا۔

اور گڈو کی معصومانہ بات میں اسے اپنی کھوج کا سراغ مل گیا تھا۔ وہ سب کچھ جان گ
تھی۔ لہٰذا اس نے یہ ذکر ہی نہیں چھیڑا۔

"آج فروری ہے۔ گڈو کی برتھ ڈے۔"

"اوہ سر' آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ مجھے معلوم ہوتا تو کوئی گفٹ ہی لے آتی۔"

"آپا نے اس کے لئے بہت اہتمام کیا ہے۔ آپ اگر اس خوشی میں شریک ہوں گ
بہت خوش ہو گا۔"

"سر۔ بن بلائی مہمان ہوں میں تو۔"

"ارے آپ مہمان کب رہی ہیں۔ اس گھر کے فرد کی طرح ہیں۔"

وہ اندر آئے تو پچھورنس نے خوبصورتی سے میز سجا رکھی تھی۔ کیسٹ پلیئر پر نور جہاں فیض کی خوبصورت نظم گا رہی تھی۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

"اوہ۔ کتنا پیارا ایک ہے۔ ہے نا۔؟" گڈو نے خوشی سے کہا۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

"آنٹی آپ یہاں آ جائیں۔ دیکھیں میں ایک پھونک میں چاروں موم بتیاں بجھا دوں گا۔"

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔

"اوہ۔ بجھا دوں موم بتیاں۔؟"

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔

"جی بیٹا۔ بسم اللہ۔"

مجھ سے پہلی سی محبت۔

"ارے بھئی آپا ذرا اس کی آواز آہستہ کر دو۔" انہوں نے آپا سے ذرا بلند آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اور دارا شکوہ تنہا رہ گئے تھے۔ آج اسے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔

"سر! آپ کا نام کس نے رکھا تھا۔؟"

"میرے چچا۔ وہ گاؤں میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ہسٹری سے انہیں خاص شغف تھا۔ ہمارے گھر میں صرف میرا نام انہوں نے رکھا تھا۔ دارا شکوہ۔ یعنی عظیم الشان گھر۔" پھر وہ خفیف سی ہنس پڑے۔

"بعض اوقات عظیم الشان گھروں میں بہت سناٹا ہوتا ہے کیوں مس کومل؟"

"آپ کے اندر تو سناٹا نہیں ہونا چاہیے سر۔ اگر عمل نہیں تو کم از کم ردعمل کی علامات تو ہوں گی آپ کے اندر۔" عجیب و غریب جملہ اس کی زبان سے پھسل پڑا۔

وہ بے تحاشا چونک گئے۔ لمحاتی سناٹا چھا گیا۔

"مس کومل۔ میں ایک وسیع الذہن شخص ہوں۔ ہر ایک بات سننے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔ میں نے اپنے ماحول سے اس طرح پیچھا چھڑایا ہے۔ جس طرح آگ میں گھر جانے کے بعد کوئی شخص دیوانہ وار بچاؤ کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ مجھے صاف باتیں کرنے والوں سے مل کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ مگر یاد رکھیے۔ بعض اوقات انسان سے غلط فیصلے سرزد ہو جاتے ہیں۔ آپ بہت معصوم ہیں۔ میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"سر! دو افراد کے درمیان جذبوں کا پل تعمیر ہو جائے تو جذبات پوچھ کر راہ چلتے ہیں۔؟"

"کوئی مجھے یہ الزام دے کہ میں نے ایک معصوم لڑکی کو ورغلایا ہے تو میں یہ بات سننے کا ظرف نہیں رکھتا۔"

دو وسیع الذہن و روشن دماغ افراد ایک دوسرے سے کس قدر بڑی بات کہہ گئے تھے۔ جس کا عام لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اور دونوں اپنی جگہ بدستور تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا سر۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ انوسنٹ گرل" (معصوم لڑکی) انہوں نے سگریٹ منہ سے نکال کر آہستگی سے کہا۔

وہ مکمل طور پر خاص لڑکی نہیں تھی۔ وہ اپنے رفتہ کی قید سے آزاد لڑکی نہیں تھی۔ اس دن اس نے خدا معلوم کن الہامی کیفیات میں گھر کر ان سے بہت کچھ کہہ تو دیا تھا۔ پھر اس دن کے بعد وہ ان کے دن کے دولت کدے پر جانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ شاید انہوں نے اسے مایوس کیا تھا۔ اگر وہ غیر معمولی لڑکی تھی تو اس کا ردعمل بھی روایتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اگر میرے ہاں عمل ہے تو ان کے ہاں ردعمل کیوں نہیں۔ انصاف کیوں شروع نہیں ہوا ابھی تک۔ انہوں نے تو کبھی نہیں کہا کہ مس کومل کبھی گھر آئیے۔ یا آپ اتنے دن سے کیوں

نہیں آئیں۔؟ نہ انہوں نے کبھی میرے گھر آنے کی تمنا ظاہر کی جب کہ پاپا تو دو ایک بار مل بھی آئے تھے۔

"آپ سے تعارف یونیورسٹی کا مرہون منت نہیں ہے سر۔ موج کا موج سے واسطہ ایک بہاؤ ہی کا مرہون منت ہوتا ہے۔ بہاؤ تو کب کا جاری تھا۔ اب تو بس ہلچل بڑھی ہے۔"

پرویس ختم ہو چکا تھا۔ وہ فائنل میں پہنچ چکی تھی۔

گھر بھر کو اس کی شادی کی لگی ہوئی تھی۔ مگر وہ بدستور ٹال رہی تھی۔ سب کو تشویش سی ہو گئی تھی۔ ایک روز امی نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے۔؟ آخر کوئی وجہ بھی ہے جو ہر موزوں رشتہ تمہیں ناپسند ہوتا ہے۔؟"

"نہیں امی۔ کوئی وجہ نہیں بس میں یکسوئی سے پڑھنا چاہتی ہوں۔"

"خیر۔ یکسوئی تو تمہیں حاصل رہے گی۔ شادی تو پڑھائی کے بعد ہی ہوگی۔"

"بس امی۔ ابھی آپ میری شادی کو رہنے دیں۔ بھائی جان کی کردیں۔ آخر ان کی شادی بھی تو ہونی ہے۔"

"سب ہی کی ہونی ہے۔ مگر سب کا خیال ہے پہلے تمہاری ہونی چاہیے۔"

"مگر امی۔ میرا یہ خیال نہیں ہے۔ پلیز۔"

"اپنی پسند سے کرنا چاہتی ہو۔ کون لوگ ہیں۔؟" وہ اسے ٹٹولنے پر اتر آئیں۔

"نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ وہم نہ کریں۔" اس نے ماں سے نگاہ چرائی۔

"ٹھیک ہے۔ کرلو تم ایم۔ اے، روک لیں گے کوئی اچھا رشتہ۔" وہ کہہ کر چلی گئیں۔

اس نے سر تھام لیا۔

قسمت اور پسند ایک دوسرے کی دوست ہوں ضروری تو نہیں۔

ایک شام وہ سو کر اٹھی تو سنبل نے بتایا کہ اس کے کوئی سر آئے ہیں ابھی ابھی۔

"وہ ایک دم چونک پڑی۔ "سر۔؟"

وہ تھوڑی دیر بعد سیاہ کڑھے ہوئے سوٹ میں ملبوس حیران سی کھڑی سردار اشکوہ کو دیکھ رہی تھی۔

"اسلام علیکم۔" آخر وہ گویا ہوئی۔

"علیکم السلام۔ بہت حیران ہو رہی ہیں۔؟"

"اس وقت کو سلام کر رہی ہوں۔ کس انداز میں مہربان ہوا ہے۔"

"اتنا اہم نہیں ہوں۔"

"اپنے بارے میں سارے فیصلے خود ہی نہیں کرنے چاہئیں سر۔"

"آج آپ کو کیسے ادھر کا خیال آگیا؟"

"میں نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ مجھے بھی چلے جانا چاہیے ورنہ شاید آپ کبھی نہ آئیں گی۔"

"اتنی اہم ہوں سر۔" اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں گئے دنوں کا قرض تھا شاید۔

"شاید؟" انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر مبہم سا جواب دیا۔

اسی دم سنبل داخل ہوئی السلام علیکم۔ فوراً" پہچان گئی ہوں آپ کو۔ شاہدہ کے بھائی ہیں ہاں آپ؟ نوکر نے مجھے بتایا کہ ایسے کوئی سر آئے ہیں مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ہیں۔ شاہدہ کیسی ہیں؟

"ابھی آپ دیکھ کر آئی تھیں۔"

اس نے سنبل کو اشارہ کیا کہ وہ اس قسم کی باتیں نہ کرے۔ وہ یک دم خاموش ہو گئی۔

"والد صاحب کہاں ہیں آپ کے؟"

"اپنے کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔" سنبل نے جواب دیا تھا۔

"اور آپ کی پڑھائی کیسی جارہی ہے؟" انہوں نے سنبل سے پوچھا۔

"فرسٹ کلاس۔!" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"ایک منٹ۔ میں ابھی آئی۔" سنبل اٹھ کر غالباً" چائے کے لئے گئی تھی۔

"آپ کافی ناراض معلوم ہوتی ہیں۔ پہلے سے مراسم محسوس نہیں ہوتے۔"

"مراسم طرفین کے تعلق کا نام ہوتا ہے سر۔ اکیلا شخص یہ بار نہیں اٹھا سکتا۔"

"آپ کو کیونکر احساس ہوا کہ آپ اکیلی ہیں۔؟" ان کی آواز بہت آہستہ ہو گئی۔ "اور گھر میں تو آپ مجھے سر نہ کہا کریں۔ "اصل" میں نفاق محسوس ہوتا ہے۔" ان کی آواز بدستور دھیمی تھی۔

"آپ کا نام لینے کا بھی حوصلہ نہ ہو گا شاید۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"رہی اصل کی بات تو پہلے مجھے ٹوٹ کر یقین دلا دیجئے" اس کی آنکھوں کے گوشے اپنی پردہ پوش محرومیوں پر بھیگنے لگے۔

"اگر یقین کی چھت چار ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے تو میری آمد کو چار ستون سمجھ لیجئے"

"اتنی سست روی اچھی نہیں ہوتی سر۔ بعض اوقات بہت دیر ہو جاتی ہے۔"

"دیر ہو تو نہیں گئی؟" انہوں نے سگریٹ کے دھوئیں سے پار اسے کن انکھیوں سے دیکھا۔

وہ خاموش بیٹھی ہاتھ مسلتی رہی۔

"کومل۔ مجھے واہموں کے ہمراہ رخصت نہ کیجئے۔"

اسی دم سنبل زالی کے ہمراہ اندر آئی۔

"ارے گڑیا۔ تم نے کیوں تکلیف کی۔؟" انہوں نے اپنی مخصوص شفقت سے کہا۔

"نہیں بھائی جان۔ میں تو آپ کو بھائی جان ہی کہوں گی اس نے یک دم رک کر اجازت طلب کی۔"

"بصد شوق۔" وہ مخصوص انداز میں مسکرائے۔

پھر جب تک دارا شکوہ رہے۔ سنبل بھی موجود رہی اور ان کی تواضع میں لگی رہی۔

◇

ان کی آمد کے باوجود وہ فائنل تک ان کے ہاں نہیں گئی یونیورسٹی میں بھی وہ کلاس ختم ہونے کے بعد لائبریری میں جا گھستی تھی۔

سمسٹرز (آخری) ختم ہونے کے بعد وہ بالکل یونیورسٹی نہیں گئی۔ اس دن وہ اپنی دوست کے ہمراہ بانو بازار آئی تھی۔ بازار سے فارغ ہو کر چاٹ کھائی۔ اس کی دوست کا گھر تو بازار کے قریب ہی تھا۔ وہ تو چلی گئی۔ اور کومل سواری کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔ سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ اسی دم دارا شکوہ کی کار اس کے قریب دھچکے سے رک گئی۔

"السلام علیکم۔!" اس نے انجانی خوشی سے مغلوب ہو کر سلام کر ڈالا۔

"گھر جا رہی ہیں۔؟"

"جی۔!"

"تو آئیے۔" انہوں نے دروازہ کھول دیا اور اس نے پیکٹ پچھلی سیٹ پر ڈال دیئے۔ اور خود سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"اکیلی آئی تھیں بازار؟"

"نہیں، وہ میری دوست یہاں رہتی ہے۔ اس کے ہاں آئی تھی۔ بازار نزدیک ہونے کی وجہ سے چند ضروری چیزیں بھی لے لیں۔" اس کی آواز بے تاثر سی ہو گئی۔

کافی فاصلہ بے حد خاموشی میں گزرا۔

"کومل۔!"

"جی۔!" (کس قدر حسن آجاتا ہے میرے نام میں جب آپ کے منہ سے نکلتا ہے)

"آپ سے چند بے حد ضروری باتیں کرنا تھیں۔ کوئی موقع ہی نہیں ملتا تھا۔"

(میں کب سے منتظر ہوں کہ آپ بھی کبھی مجھ سے اپنے طور پر بات کریں)

"کومل۔! مجھے دکھ ہو گا اگر تمہیں کوئی دکھ ملا، مگر کومل ایک بات صاف صاف کہہ دینا چاہوں گا کہ میں عام انسان ہوں۔ مگر اپنی عزت و وقار کے معاملے میں شاید عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوں۔ میرے دل میں بھی خواہشات ہیں۔ میں ذہنی اذیت جسمانی مشقت میں اپنی خواہشات کی قیمت ادا کر سکتا ہوں۔ مگر اپنے وقار کو اپنی کسی آرزو کا مول نہیں بنا سکتا۔

تمہاری خاموش گفتگو میں نے بارہا سنی ہے مگر میری خاموشی کی ایک وجہ تھی کہ مجھے علم ہے تمہارے سرپرست کبھی اس بات کو قبول نہیں کریں گے کہ تم ایک خوبصورت۔ تعلیم یافتہ اور دولت مند لڑکی ہو۔۔ میں ایک شادی شدہ مرد اور ایک بچے کا باپ!

کومل۔۔ یہ ساری جدوجہد اس مقام و وقار کے لئے تو تھی۔ تم اگر زبردستی انہیں مجبور کر بھی دیتی ہو تو میں ان کے دل سے وہ عزت و مقام تو نہیں پا سکوں گا جو بہرحال میرا حق ہے۔ زیادہ الزام مجھ پر ہی آئے گا کہ تم تو ایک کم عمر لڑکی ہو اور میں زمانے کھیلا ہوا ایک پختہ عمر مرد۔ اور میں اپنے مقام سے نیچے آنا اور وقار کو داؤ پر لگانا کبھی پسند نہیں کروں گا۔ لہٰذا بات اگر میری پسند کے مطابق بنتی ہے تو میں تمہیں مزید اذیت دینا کبھی پسند نہیں کروں گا۔ میرے والدین کبھی بھی تمہارے گھر آجائیں گے۔ لیکن تم کسی دھمکی سے جبرا" کوئی بات نہیں منوا ی۔ انہیں قائل کر سکتی ہو تو کر دو۔ ورنہ میں تو ہر شے کو اپنے وقار کے بعد دیکھتا ہوں۔ ا مقام پر تم مجھے خود غرض بھی کہہ سکتی ہو۔"

ں نے اس کو خود چل کر پکارا تھا۔ وہ خوشی سے گم سم سی بیٹھی رہ گئی۔

''لو بھلا۔ امی۔ پاپا کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔؟ اور آپ کو کیا۔ شکوہ صاحب انہیں کسی طرح بھی راضی کروں مقصود تو منزل پانا ہے۔''

◇

پاپا تو صدمے سے آدھے ہو کر رہ گئے۔

''تم جانتی ہو اس کا باپ ہمارا نوکر رہا ہے۔ کیا دنیا ہم پر نہیں تھوکے گی۔؟''

''مجھے بہت اچھی طرح پتا ہے خان صاحب۔!'' اس کی امی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

''پڑھ لکھ کر وہ ہمارے رتبوں کے برابر نہیں ہو گیا ہے۔ تم اسے سمجھانا۔ ہمارے ہاں آج تک کسی لڑکی نے ایسی حرکت نہیں کی۔''

''میں نے تو آپ سے ذکر کرنے سے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا۔ وہ نہیں مان رہی۔ کہتی ہے ورنہ میں کہیں بھی شادی نہیں کروں گی۔''

''تم اسے بتا دینا اگر اس نے ضد سے بات منوانے کی کوشش کی تو عمر بھر پھر اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکے گی۔''

''ذات کے وہ برے نہیں ہیں خان صاحب۔ یہ تو آپ کو بھی پتا ہے۔ وقت برا آ جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔''

''میں تم سے کسی حماقت کی توقع نہیں رکھتا۔'' انہوں نے بیوی کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورا۔

وہ سہم کر خاموش ہو رہیں۔

پھر انہوں نے بیٹی تک باپ کے خیالات پہنچا دیے اور وہ صدمے سے مرنے کو ہو گئی۔

''اب یہ اچھا لگتا ہے۔ کل تک مالک کہنے والا دیوان پر ساتھ بیٹھے۔ رشتہ داریاں بنائے۔ کیوں؟'' امی نے استفسار کیا۔

''امی اگر کسی نے ہماری زمین پر چند روز کام کر لیا مجبوری کے تحت تو وہ ہمارا زر خرید تو نہیں ہو گیا؟''

اور پھر اس نے ماں کو سو سو دلائل دے ڈالے مگر وہ بھی مجبور تھیں۔ جس قدر وہ اپنی جان کو اذیت دے سکتی تھی دے لی۔ جس قدر رو سکتی تھی رو لی۔

آخر والدین شکست کھا گئے۔

نہایت سادگی سے نکاح ہوا تھا۔ اس کے ساس سسر رشتہ مانگنے آئے۔ اور پاپا نے دو روز بعد کی تاریخ دے دی۔

بیما عطاء کے ساتھ جاپان گئی ہوئی تھی۔ باقی سب لوگ آئے تھے۔ مگر پھر ایک اداسی کا سا تاثر رہا تھا کہ بزرگ پر اسرار انداز میں خاموش تھے۔

نکاح کے بعد کمرہ خالی کرنے کو کہا گیا پاپا اندر آ گئے۔ امی بھی ہمراہ تھیں۔

''کومل۔ تم شاید سوچتی ہو گی کہ تمہارا باپ تمہیں خالی ہاتھ رخصت کر رہا ہے۔ مگر میں اپنا حق پہچانتا ہوں۔ میں ایک لاکھ کا چیک تمہارے سسر کو دے چکا ہوں۔ جیسے چاہو خرچ کر لینا۔'' پاپا بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔

''تم معصوم و کم عمر تھیں تمہیں بہکایا گیا۔ تم بہک گئیں۔ میرے دل میں دارا شکوہ کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اگرچہ میں اب تک اسے ایک اچھا انسان سمجھتا رہا تھا آج تم رخصت ہو رہی ہو۔ آج کے بعد تم کبھی اس گھر میں داخل نہیں ہو گی۔ میرے گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لئے بند ہو رہے ہیں۔ اب اپنے ہر قول و فعل کی تم خود ذمہ دار ہو۔''

وہ تیزی سے باہر نکل گئے کومل ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اور امی بے ہوش ہو کر نیچے گر پڑیں۔

◇

دارا شکوہ کا مضبوط وجود اسے وہ خوشی نہ دے سکا جو ملنی چاہیے تھی۔ باپ کے کلمات آنسوؤں کا گولا بن کر اس کے حلق میں پھنسے ہوئے تھے۔

اگلے روز چھوٹی سی دعوت ہوئی تھی۔ ارسلان بہن کا بھرم رکھنے کو چھپ چھپا کر آ گیا تھا۔

''سنبل نہیں آئیں۔؟'' انہوں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے امی بھی نہیں آ سکیں۔'' اس نے نظر بچا کر بہنوئی کو جواب دیا تھا۔

اس کے اگلے روز وہ بہت اصرار سے دارا شکوہ کو ساتھ لے کر گاؤں چلی آئی۔

پندرہ دن وہ وہاں رہی پھر لاہور واپس آ گئی۔ دارا شکوہ اس سے تین دن پہلے لاہور جا چکے تھے۔ وہ گڈو اور شاہدہ کے ہمراہ لاہور پہنچی تو وہ یونیورسٹی گئے ہوئے تھے۔ وہ اور شاہدہ گھر میں

مصروف ہو گئیں۔ ان کے آنے سے آدھ گھنٹہ پہلے وہ بہت اچھی طرح تیار ہو گئیں۔
ساڑھی نمائی نیک اور فل سلیوز بلاؤز کے ہمراہ پہن کر ہلکا ہلکا میک اپ کیا۔ اور بے چینی کے
عالم میں کھڑی ہو گئی۔

ان کی وہائٹ گاڑی دیکھ کر ایک عجیب مسرت انگیز احساس اس کے وجود میں سرایت کر
گیا۔

وہ ان کا استقبال کمرے ہی میں کرنا چاہتی تھی اس لئے باہر نہ نکلی۔

وہ گڈو اور شاہدہ سے مل کر کافی دیر بعد کمرے میں آئے۔ وہ اندر داخل ہوئے تو ان
کے ہمراہ شاہدہ اور گڈو بھی تھے۔ وہ سنبھل سی گئی۔ اور اس نے بڑی سادگی سے انہیں سلام
کر ڈالا۔

شاہدہ اس کی سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ گڈو کمرے میں بھاگنے دوڑنے لگا۔ وہ
خاموشی سے بیڈ کی سلوٹیں دور کرنے لگی۔

ہر بار وہ پہل کرتی رہی تھی مگر جانے کیوں اب وہ بالکل خاموش تھی۔ وہ بیڈ پر ٹک کر
جوتے اتارنے لگے تھے۔

وہ دونوں پھوپھی بھتیجے اپنی شرارتوں میں مصروف تھے۔ اس نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر
دیکھا۔ ان کا چہرہ قطعی بے تاثر تھا۔ مطمئن سا کوٹ وہ اتار چکے تھے۔ گلابی لائنوں والی سفید
قمیض کے کف اور گریبان کھل چکے تھے۔ گویا لباس بدلنے کی علامات تھیں۔ وہ باتھ روم
میں چلے گئے۔

"شاہدہ۔ ذرا گڈو کو تیار کر دو۔ دیکھو۔ کتنے کپڑے گندے کر لئے ہیں۔ حالانکہ دو گھنٹے
پہلے میں نے پہنائے تھے۔ میری اچھی بہن۔"

شاہدہ مسکراتی ہوئی گڈو کو باہر لے گئی' اس نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔

اسی دم شکوہ صاحب بھی باہر آ گئے باتھ روم سے۔ وہ دروازے سے پشت لگا کر کھڑی ہو
گئی تھی۔

"شاید آپ کا بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ آپ نے تو خیریت بھی معلوم نہیں کی۔" آخر
وہ برداشت نہ کر سکی۔ ڈارک براؤن شلوار سوٹ میں ملبوس وہ کہیں کسی سوچ میں گم تھے۔
اس کی آواز پر چونک پڑے۔

"میرا خیال ہے میرے سیدھے سادے والدین نے تمہارا بہت خیال رکھا ہو گا۔"

"جی ہاں اماں بھی بہت اچھی ہیں اور ابا جی بھی۔ لیکن کیا آپ باہر سے آ کر بات نہیں
کرتے گھر میں۔ اگر نہیں تو میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ میں نہیں چاہوں گی میری کسی بات
سے آپ کو کوفت محسوس ہو۔"

وہ آستین کے کف پلٹتے ہوئے اس کے بالکل نزدیک آ گئے۔

"دراصل میں پرسوں مسلم ٹاؤن تمہارے والد کے ہاں گیا تھا۔"

کومل۔ ابیں

کومل کا دل دھڑ دھڑ بجنے لگا وہ نظریں نہ اٹھا سکی۔

"کومل امید ہے آج تم اپنے والدین کے ہاں جانا پسند کرو گی۔ میرے ساتھ جاؤ گی یا
اکیلی۔ آخر تم جس دن سے میری بنی ہو ایک مرتبہ بھی اپنے والدین کے ہاں نہیں گئیں۔ یہ
زیادتی ہے تمہارے ساتھ۔ والدین آخر والدین ہیں۔ کس وقت لے چلوں تمہیں؟"

وہ مخصوص ٹھنڈے لہجے میں بول رہے تھے۔ اور وہ سر جھکائے ہونٹ چبا رہی تھی۔ وہ
بے خود دیکھتے رہے۔ وہ بالکل خاموش ہو چکی تھی۔ معاً اس کی آنکھوں سے کئی قطرے
اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ پھر یہی قطرے سلسلے وار بہنے لگے۔ وہ چہرہ ہاتھوں میں
تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم رو رہی ہو کیا میری بات بری لگی۔ لیکن میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔؟ رونے کا مقام
تو اس وقت میرے لئے تھا جب میری کار دیکھ کر بھی چوکیدار نے گیٹ نہیں کھولا تھا۔ خان
حسین خاں کے چوکیدار نے۔ اپنا آپ شوٹ کرنے کو جی چاہا تھا میرا۔ جب چوکیدار نے
کہا صاحب کا حکم ہے۔ کومل بی بی اور ان کا آدمی ادھر نہیں آئیں گے۔

کومل جان۔ توہین کرانا تھی تو اپنے والد سے کراتیں۔ ایک معمولی چوکیدار سے۔ کیا
تمہیں اپنا کر اس قدر بے قیمت ہو گیا ہوں۔

کومل میں نے تم سے کیا کہا تھا۔؟

کومل۔ اگر بے وقار رہنا ہوتا تو اس قدر محنت کی کیا ضرورت تھی۔ اپنے باپ کے شانہ بہ
شانہ چل لیتا۔ تمہارے والد ایک مشہور "آدمی ہیں اور میں بھی اس شہر کا جانا پہچانا شخص
ہوں۔ تمہارے والد صاحب کس قدر عزت افزائی کر چکے ہیں۔ اور کریں گے۔!

کیا ہر ایک استاد بھی اس قدر گیا گزرا ہوتا ہے کہ۔۔۔

بتاؤ۔ کیا میں نے تمہیں اندھیرے میں رکھا بہکایا۔ جواب دو۔"
"کون کسی کو بہکا سکتا ہے۔ بہکانے کو دل کیا کم ہے۔" وہ خاموشی سے کھڑی ہونٹ چباتی
رہی۔
"میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔؟"
"آ۔ آپ۔ یہ بھی تو سوچئے۔ کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔؟ کس کے لئے کیا۔؟؟" اس نے
بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل کہا۔
"بلاشبہ یہ بہت بڑی قربانی ہے۔ لیکن اس کی قیمت تم نے نہیں میں نے ادا کی ہے۔ اپنی
نفس کی قیمت اپنے وقار کی قیمت۔ اپنے نام کی قیمت والدین تو شاید تمہیں زندگی کے کسی
مقام پر گلے سے لگالیں۔ تمہارے نفع کا امکان تو ہے۔ میرے پاس کیا تھا کومل۔ تم نے مجھے
دھوکہ کیوں دیا۔ تم نے میرا وقار لوٹ کر اپنی خوشی حاصل کی ہے۔"
کومل کا ذہن تپ گیا۔ اپنی خوشی۔ "صرف میری خوشی۔؟"
"ہاں کومل۔ صرف تمہاری خوشی۔ میری ذات کے ایک پلڑے میں وقار اور دوسرے
پلڑے میں سارے جہان کی خوشیاں۔ یہی میری ذات کا توازن تھا۔
تم نے میری ذات کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔"
"اب اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے آپ کے لئے بڑی ہے تو صرف میرے لئے۔ آخر مجھ
سے میرے خون کے رشتے جدا ہوئے ہیں۔ آپ بھی محبت کے بجائے خود غرضی کا مظاہرہ کر
رہے ہیں۔" اس کی آواز میں تھوڑی سی برہمی شامل ہو گئی۔
"میں گالیوں کا برا نہیں مانا کرتا۔ کومل میں ٹین ایجر نہیں تھا۔ نوعمر و نوخیز جو کسی لڑکی کو
جیت کر ہیرو بننے کا شوقین ہوتا ہے۔ میری زندگی میں آرزو تھی کہ میرا وقار و نام ہو۔
خوبصورت بچے معاشی آسودگی۔ میری ذات کو کھوجنے والی اور جاننے والی تم تھیں۔ تم نے
پردہ ہٹانا چاہا میں نے اتار ہی دیا۔ میری ذات کو پڑھنے والی۔ میری خامیوں سے محبت کرنے
والی تھیں تم۔ مجھے اچھی لگیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں کسی نوعمر ہیرو ٹائپ
نوجوان کی طرح ہر چیز داؤ پر لگا دوں گا۔ جو چیز میں نے برسوں کی محنت سے حاصل کی تھی۔ وہ
ایک لمحے میں کھو گئی ہے۔ جب کوئی خان صاحب کے سامنے ہمارا تذکرہ کرے گا تو وہ تمہیں
بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے۔ مجھے ایک پیچ انسان کہیں گے۔ تمہیں کھونے کے بعد

تمہارے ہار جانے کے بعد ان کے دل میں میرے لئے کس قدر نفرت کا زہر ہو گا۔ جب وہ مجھے
پیچ کہا کریں گے تو لوگ سمجھیں گے جانے کس قدر پیچ ہوں۔ اس کا احساس ہے تمہیں۔؟ اگر
مجھے بھی گمنام اور ذلت آمیز زندگی گزارنا تھی تو مجھے اس قدر محنت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔
باپ کے ساتھ ہل ہی چلا لیتا۔"
ان کی آواز میں غضب و اشتعال نہیں تھا۔ وہی مخصوص دھیما پن تھا لہجہ البتہ خفگی کی
چغلی کھا رہا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر پردہ اٹھا کر باہر نکل گئے۔
شام کا کھانا گڈو اور شاہدہ نے کھایا۔ دارا شکوہ گھر پر نہیں تھے۔ اس کا دل ہی نہیں چاہا۔
وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی۔ گاڑی رکنے کی آواز آئی مگر وہ
اسی طرح بیٹھی رہی۔ کافی دیر بعد وہ اٹھ کر خواب گاہ میں آئی۔ وہ نیم دراز ہائی فوکل عینک
لگائے کسی کتاب میں گم تھے۔ بے حد باریک فریم کی عینک تھی۔ وہ انہیں پہلی مرتبہ لگائے
دیکھ رہی تھی۔ (شاید آج ہی بن کر آئی ہے) گرے کلر کے سلیپنگ سوٹ میں ملبوس وہ بہت
محویت سے کتاب دیکھ رہے تھے۔ وہ پردہ تھامے چند لمحے محویت ٹوٹنے کا انتظار کرتی رہی۔ مگر
تھوڑی دیر بعد بمشکل گویا ہوئی۔
"کھانا لگاؤں؟"
نہ وہ چونکے نہ سر اٹھایا۔ صرف سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔
خواب گاہ کی تنہا یہ تیسری رات تھی۔ پہلی رات ساس و نند نے اسے ایک حیرت انگیز چیز
سمجھ کر خوب دل بھر کر اس کے ساتھ وقت گزارا۔ اس کی خدمت میں لگی رہیں۔ ڈیڑھ بجے
شب اس کی ساس نے اسے زعفرانی کھیر کھلائی تھی۔ دو بجے شب کو اس کی نند کو اس کی
چوڑیوں کی سیٹنگ پسند نہیں آئی تھی۔
"بھابی! ایک سونے کی چار شیشے کی لگا کر پہنیں۔ آپ کو کس نے پہنائی ہیں۔ یہ اس طرح
سے۔" وہ خاموش نند کے ہاتھوں درگت بنواتی رہی تھی۔
ڈھائی بجے شب وہ اس سے ملے تھے مگر کھلے نہ تھے صرف اس سے بہت خوبصورت۔
سنجیدہ باتیں کرتے رہے۔ وہ ویسے ہی سہمی ہوئی تھی۔
تیرہ دن گاؤں میں رہی اور ساس مارے محبت و فخر کے اسے اپنے ساتھ سلاتی رہی
تھیں۔ یا پھر آج کی شب وہ مکمل سناٹوں کے ہمراہ تنہا تھے۔ وہ لباس بدل کر آئی اور خاموش

سے صوفے پر بیٹھ کر کتابیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔ وہ ایک کتاب پر جھکی ہوئی تھی کہ بجلی
بلب آف ہو گیا اور کمرے میں صرف نیلگوں روشنی کا راج ہو گیا۔ اس نے سر اٹھا کر ان کی
جانب دیکھا۔

وہ کروٹ بدل چکے تھے۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کے پھندے لگنے لگے تھے۔ وہ مجسم
جیسا گن تھی۔ خوبصورت و بھرپور لڑکی۔ یہ انداز اس کی توہین تھے۔ وہ دوسری سمت سے
آکر بیڈ پر دراز ہو گئی۔

وہ تو "اس بڑے جہان" کی خاطر چھوٹی دنیا کو تج کر آئی تھی۔ تنہا ہونے کا احساس اس قدر
جان لیوا تھا کہ وہ بے اختیار سسک پڑی۔ جس کے لئے اتنا کچھ کیا اسی میں اتنا نخرہ۔ کیا شادی
کے بعد "محبت کا انصاف" ختم ہو جاتا ہے؟

اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں کمرے کے سکوت میں ارتعاش پیدا کرنے لگیں۔ تب انہوں
نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تم میری پوزیشن صاف کر دو اپنے والدین کی نظر میں۔ مجھے میرا جائز مقام دلا دو۔
حقیقت کیا ہے انہیں بتا دو۔ میں ان سے انا کی جنگ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میرے لئے سایہ
ہیں بہت تکریم ہے۔ ان کی میرے دل میں عزت میری بھوک۔ تکریم میری پیاس ہے۔ میں
شکم سیر ہونا چاہتا ہوں ان نعمتوں سے تم ۔۔۔ تم ۔۔۔ کل چلی جانا کومل۔ بزرگوں کو ناراض کر
کے ہم آسودہ نہیں رہ سکتے۔ خان صاحب سے اپنا آپ منوانا میری تمنا ہے۔ تم سے بھی بڑی
تمنا۔ جان۔ تھوڑے دکھ اور پھر شاید خوشیاں۔"

"بس کیجئے پروفیسر صاحب' یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے
لئے بند ہو چکے ہیں' آپ مجھے جانے کو کہہ رہے ہیں؟"

"ان کے دل کے دروازے فولاد کے نہیں ہیں کومل!"

"آپ کو کیا پتا۔؟" وہ سسکیوں کے درمیان بگڑ کر بولی۔

"پتا تمہیں نہیں ہو سکتا۔ مگر میں۔ میں جانتا ہوں کہ میں بھی باپ ہوں ان جذبوں کی سمجھ
فی الحال تمہیں نہیں ہے مگر مجھے تھوڑی بہت ہے۔
تمہیں میری سمجھ ہے' تم مجھے جانتی ہو۔ آخر کیوں یقین نہیں آتا تمہیں کہ میں صحیح جا رہا
ہوں۔"

"آخر۔ آپ کو کیا پڑی ہے دکھ تو مجھے ہونا چاہیے۔" وہ پھر بسوری
"تم کافی نادان ہو معاف کرنا۔ شادی دو انسانوں کا ملاپ نہیں ہوتی۔ دو خاندانوں کے
تعارف و ملاپ کا نام ہے۔ دو ملتے ہیں تو سدا دو ہی نہیں رہتے۔ کل کو ہم اپنی اولاد کو کیا
جواب دیں گے۔
"اتنی دور کیوں جاتے ہیں۔" وہ تھوڑا جھینپ کر بولی۔
"میں زندگی پر سکون انداز میں گزارنے کا خواہشمند ہوں زندگی مستقبل کے ستون پر کھڑی
ہوتی ہے۔ میں شام سے بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ تم کل واپس چلی جانا۔ انشاء اللہ۔"
اور وہ مارے طیش کے تکیہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔ ان کی بات ادھوری چھوڑ کر۔
صبح جب تک وہ یونیورسٹی نہ چلے گئے۔ وہ ان کے سامنے نہ آئی اور ان کے جاتے ہی وہ
تھوڑا بہت تیار ہوئی اور صرف پرس اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ شاہدہ اس سے پوچھتی ہی رہ
گئی۔

اپنے میکے کا سیاہ گیٹ دیکھ کر اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ اس گھر کی بیاہی ہوئی بیٹی
تھی۔ درماندہ بیٹی۔ مگر بیٹی تھی کل تک وہ کتنی بے نیازی سے کتنے دھڑلے سے اندر داخل
ہوتی تھی۔ دوپٹہ ادھر ڈال۔ شور مچاتی۔ ماں کو شرارتوں سے زچ کرتی ہوئی۔ اور آج قدم
من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کیسا اجنبی لگ رہا تھا راستہ۔ کیسا پرایا لگ رہا تھا گھر۔
پاپا آفس جا چکے تھے۔ یہ ان کا گھر چھوڑ دینے کا ٹائم تھا۔ چوکیدار نے اسے دیکھ کر سلام کیا
گیٹ کھولنے سے معذوری ظاہر کی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
"اچھا۔ امی کو تو بلا سکتے ہو گیٹ پر۔" اس نے ملتجی انداز میں کہا۔
تب وہ اندر چلا گیا۔ امی تقریباً بھاگتی ہوئی آئیں۔ ننگے پاؤں ماں کو دیکھ کر اس کا دل چاہا
پھوٹ پھوٹ کر روئے۔
"گیٹ کھولو مجید۔" وہ تڑپ کر بولیں۔
"بیگم صاحب۔ خان صاحب ہم کو گولی مار دیں گے۔"
"یہ میری ذمہ داری ہے تم کھولو' آنے دو اسے اندر۔" وہ بے تابی سے بولی تھیں۔ آہ'
اس سہاگن بیٹی کا نصیب۔
گیٹ کھل گیا۔ وہ ماں کی آغوش میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے کا پروگرام بنا کر ماں

کی طرف بڑھی مگر تیور اکرماں کے بازوؤں میں آ رہی۔

◇

ساری بات سن کر امی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

"بالفرض محال اگر تمہارے باپ نہ مانے تو وہ تمہیں بسا لے گا؟"

"شاید مگر میں ساری زندگی ان سے نظر ملا سکوں گی؟ امی! انہوں نے تو مجھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بات اس طرح بنے کہ میرے وقار کو دھچکہ نہ لگے۔ کہتے ہیں میں ہر دکھ برداشت کر سکتا ہوں مگر اپنی توہین نہیں۔ اور امی! آزادی سے قبل ان کا گھرانہ معزز گھرانہ تھا۔ آزادی کے بعد ان کے پاس دولت نہ رہی تو ان کا وقار بھی جاتا رہا۔ امی! کیا پایا۔ محض دولت کے۔"

"نہیں بیٹی! تمہارے باپ کو تو یہ دکھ ہے کہ ان کا نوکر ان کا سمدھی بنا ہے۔ بیٹی! دنیا میں رہنا ہے تو لوگوں کی باتوں کی بھی فکر کرنا پڑتی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ نام کے خان صاحب تھے۔ خدا معلوم کس قدر کم ذات ہیں ہم لوگ کہ۔۔۔ اور کوئی بات نہیں میری بچی۔"

انہوں نے زرد رو بیمار بیٹی کا منہ چوما۔

"تم بھی اس کے ساتھ چلی جاؤ۔" وہ ایک دم غضب ناک ہو گئے۔ بات بھی پوری نہیں سنی۔

"آپ آخر پوری بات کیوں نہیں سنتے؟" امی بھی بگڑ گئیں۔ امی نے ان کے گھٹنے چھو چھو کر انہیں تمام بات بتائی۔

"حقیقت کو سمجھئے۔ جذباتی نہ بنیں ایک بیٹی اور بیاہنی ہے ابھی۔ دولت آپ کی نظر میں اس قدر اہم ہے۔ اس طرح تو کوئی نو دولتیا چمار خود کو سید زادہ آل رسول بتا کر بیٹی بیاہ لے جائے گا' جہاں اس کا خاندان چمڑا ہی پرکھتا ہو۔ دولت ایسی بھی پردہ پوش نہیں ہوتی کہ اوقات بالکل ہی ڈھانپ دے۔ خان صاحب! آپ کا اپنا دل بھی تسلیم کرتا ہے۔ آپ کا داماد کم ذات نہیں ہے۔ باشعور ہے۔ عزت کو جان سے زیادہ جانتا ہے۔ اگر اسے آپ کی بیٹی ہی ہتھیانی ہوتی تو۔ بھیجتا وہ بیوی کو۔۔۔ کہ جاؤ اپنے باپ سے قبولیت کی بھیک لاؤ۔ بیٹی لے جانا ہی بڑی بات تھی۔ تو بیٹی وہ لے جا چکا تھا۔ اگر کوئی اعلیٰ نسب' دولتمند داماد آپ کو مل جاتا جو حرام و حلال کا فرق کئے بغیر آپ کی بیٹی کو ہیروں سے سجاتا' ریشم پر سلاتا سونے کی پاپوش پہناتا

دل کو اندھی کمائی کی سزا میں۔۔۔۔۔ جب کہ آپ کا داماد تو آپ کا دیا ہوا چیک بھی واپس کر گیا ہے۔ آپ کو قدر کرنا چاہیے خان صاحب۔ میری تو عقل حیران ہے کہ میں عورت ہو کر سب سمجھ سکتی ہوں۔ اور دوسری طرف آپ دنیا سمجھنے کے دعویدار۔ معافی کے ساتھ کہہ رہی ہوں خان صاحب۔ اور کلیجہ شق نہ کیجئے۔ پچھلے پندرہ سولہ دن سکرات میں گزرے ہیں میرے۔۔۔؟"

ان کی آواز بھرا گئی۔

"تمہاری انہی سیدھی حمایت کرنے کی عادت دوسرے بچوں کی نامعقول حوصلہ افزائی کا سبب بن سکتی ہے۔ جاؤ یہاں سے' خدا کے لئے میرا بلڈ پریشر نہ بڑھاؤ۔ جاؤ۔ چلی جاؤ یہاں سے۔"

انہوں نے بیزار سے انداز میں کہا۔

وہ تو مارے خوف کے پاپا کے سامنے ہی نہیں آئی تھی۔ کھانے پر امی نے کہلوایا تو پاپا خاموشی سے کھانے میں مصروف رہے۔ مگر اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ ارسلان اور سنبل اس کی دل جوئی میں لگے ہوئے تھے۔

سیما کو ہوا لگی۔ وہ ایک دم دوڑی چلی آئی۔

وہ زرد کپڑوں میں بیمار بیمار سی لیٹی ہوئی تھی۔ سیما کو دیکھ کر وہ بے ساختہ لپٹ کر رونے لگی۔

"پاگل۔ کیا ہے یہ سب۔؟" اس نے اسے پیار کیا۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بے حد اداس لگ رہی تھی۔

"اور کس قدر چھپی رستم نکلی۔ اور جو میں نے اس دن چھیڑ دیا تھا۔ تو صاف انکار کر دیا تھا۔ اس طرح ان کے قصیدے پڑھے میں تو سمجھی تھی کہ قرطبہ یا مدینہ میں امام ہو رہے ہیں۔ یا دنیا تیاگ رہے ہیں۔"

"اس وقت مجھے اس چیز کا اندازہ نہیں تھا۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"پھر جب اندازہ ہوا تو کیا ہوا؟" سیما نے اسے شرارت سے دیکھا

"ایسا لگا جو ان کے بغیر گزری تو زندگی نہ ہوگی۔" اس نے ہونٹ کاٹے۔

"اب کیا ہے۔؟"

"زندگی تو نہیں ہے۔" اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"بے وقوف۔ کیا ضرورت تھی آنے کی 'ماموں جان ایک نہ ایک دن نرم ہو ہی جاتے۔"

"انھوں نے خود نکل جانے کو کہہ دیا۔ کیا کرتی پھر" وہ رونے لگی۔

"ارے بھی روؤ مت ذرا دیر کو وطن سے دور ہوئی کیا کیا انقلاب آنے لگے۔"

"آپا۔۔ آپ کا فون ہے۔" سنبل اندر داخل ہوئی۔

وہ تیزی سے باہر لپکی۔ سیما نے اس کو دیکھا بڑی گہری نظروں سے۔

"ہیلو۔۔!"

دوسری طرف گڈو تھا۔

"سلائے کوم امی۔" (السلام علیکم امی)

"وعلیکم السلام زندگی 'کیسے ہیں بیٹا آپ۔۔؟"

"امی میں ٹھیک ہوں۔ آپ کہاں چلی گئی ہیں۔ ابو رات بہت دیر سے آئے تھے۔ پھوپھو بھی رو رہی ہیں 'امی۔ پھوپھو کیوں روتی ہیں؟ امی! آپ کہاں ہیں؟ سب کی امیاں گھر پر رہتی ہیں آپ کیوں چلی گئی ہیں۔۔؟ میں ابو سے بالکل بات نہیں کروں گا پہلے جھوٹ بولتے رہے کہ آپ آنٹی ہیں جس دن آپ چیک والے کپڑے پہن کر آئی تھیں ناں تو کہنے لگے کہ یہ تمہاری امی ہیں بہت جھوٹے ہیں ابو۔ پہلے آپ کو کیوں آنٹی کہتے تھے۔ امی آپ آجائیں ناں۔ آپ جلدی آجائیں۔ وہ ابو آرہے ہیں۔ بات کریں گی۔۔؟"

کومل نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔ اور ٹیلیفون سیٹ پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی۔

"کس کا فون تھا کومل۔۔؟" سیما نے پیچھے سے آکر پوچھا۔

"میرے بیٹے کا۔" وہ گم صم سی تھی۔

"کچھ جلدی نہیں ہو گیا۔۔؟" سیما ہنس پڑی۔

"میرا مطلب ہے سیما' گڈو کا۔" وہ کمرے کی طرف پلٹ گئی۔

◇

ابھی تک اس کا اور پاپا کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ کمرے میں بند رہتی تھی۔ کئی بار جی چاہا پاپا کے قدموں میں سر رکھ کر اتنا روئے کہ پاپا کے اندر کے سارے پتھر پگھل جائیں۔

"اور پروفیسر صاحب۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اتنی آسانی سے آپ کی بات سن کر یہاں

چلی آئی۔ وقت میرا ہو جائے تو پھر دیکھیے گا۔"

وہ اندر ہی اندر بسورتی۔

اسے رہتے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے تھے۔ رمضان کے دن آ چکے تھے۔ ہر طرف عید کی تیاریاں تھیں۔

چاند دیکھنے کے بعد لوگ پاپا کو خوشخبری سنانے گئے۔ وہ ملگجے کپڑوں میں گرل تھامے باہر جھانک رہی۔ پاپا چاند ان کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ چاند دیکھنے کے بعد وہ امی پاپا کو سلام کرتے جس کے جواب میں ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوبصورت دعائیں دیا کرتے۔ یہ سب کچھ سوچ کر اس کے آنسو بہنے لگے۔

روزانہ کی طرح اس کا کھانا اندر ہی آ گیا تھا۔ مگر کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

زندگی میں کوئی خوشی محسوس ہوتی تھی نہ امنگ۔ وقت کس دوراہے پر لے آیا تھا۔ اسی دم بھاری قدموں کی چاپ اس کی پشت پر ابھری۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ اس کا جسم کانپنے لگا۔ ایک دم متوحش ہو گئی۔ آواز حلق میں گھٹ گئی۔

باپ سے سو سو ناز اٹھوانے والی بیٹی 'اس طرح اجنبیت سے دیکھ رہی تھی گویا پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ اس کا دم باپ کو دیکھ کر حلق میں اٹک گیا۔ گویا لیور دبانے والے جلاد کو دیکھ لیا ہو۔ پاپا کے دل پر قیامت گزر گئی۔ چہتی 'ہنستی بیٹی مدقوق سی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد ہالے۔ اجاڑ صورت۔

"پپا۔۔ پپا۔۔ پاپا۔ پلیز۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے پھوٹ پھوٹ روئی اور وہیں گر پڑی۔ انھوں نے اسے اس طرح گرتے ہوئے دیکھا اور لپک کر آئے۔ وہ بے رونق اجاڑی سی بیٹی کو بغور دیکھ رہے تھے۔

اولاد والدین کے جسم کا حصہ ہوتی ہے جسم کے کسی حصے کو تکلیف ہو تو بہت بے قراری بے سکونی رہتی ہے۔ ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

ڈاکٹر آیا 'اس کا چیک اپ کیا۔ ذہنی سکون دینے کی ہدایت کی۔

"آپ نے ضرور کچھ کہا ہو گا۔" امی نے روہانسی آواز میں شوہر سے کہا۔

"میں تو کوئی بات بھی نہیں کر سکا۔" وہ پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔

ارسلان اپنی سو مصروفیات چھوڑے اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ سنبل الگ ہراساں تھی۔

...ی۔ ڈاکٹر سکون کا انجکشن لگا کر گیا تھا۔

◇

عید کا دن ان کے لئے خوشی نہیں بن سکا۔ وہ بستر پر پڑی سب سے عید ملتی رہی۔
پاپا عید کی نماز پڑھ کر آئے تو وہ ساری رات جاگنے کے سبب بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں
نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ دو موتی ان کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ ان کے گھر کی رونق
اس گھر کی چہکار، ناتواں حالت میں بستر پر پڑی تھی۔
وہ دیر تک اس کی صورت دیکھتے رہے۔
ان کی خوبصورت و ہنس مکھ بیٹی۔ جو بچپن میں ان کے ساتھ روزانہ کہیں جانے کی ضد کر
بیٹھتی تھی۔ راستے میں بے شمار چیزوں کی فرمائش کرتی تھی ضد کرتی تھی ان کی انگلی پکڑ کر
ادھر ادھر دکانوں پر گھس جایا کرتی تھی۔
اسے منوانے کی عادت تھی اور انہیں ماننے کی پھر اب کیا ہوا تھا۔ سب کچھ معمول کے
مطابق ہی تو ہوا تھا۔ وہ جانے کیا سوچ کر باہر نکل گئے۔
وہ دوپہر بارہ بجے جاگی تھی۔ مگر اسی طرح پلنگ پر لیٹی رہی۔
سب لوگ اس سے ملنے اس کے کمرے میں آئے مگر وہ ذرا نہ مسکرا سکی۔ جب دل رو رہا
ہو۔ تو کوئی کیسے مسکرا سکتا ہے۔

◇

"بیٹی! تمہارے پاپا کہہ رہے ہیں۔ تم کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔" امی نے کمرے میں
آکر کہا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔
"تمہیں۔ تمہارے گھر لے کر جا رہے ہیں۔" امی نے مسکرا کر کہا اس نے گھبرا کر ماں کی
صورت دیکھی۔ پھر کمبل تان کر لیٹ گئی۔ بڑے پرسکون انداز میں امی نے اسے بہت سمجھایا
وہ خاموش لیٹی رہی تب ہی اس کی کزنز کا غول کمرے میں وارد ہوا۔ سب نے اسے مل کر
زچ کیا۔
تب وہ جانے کیا سوچ کر اٹھی۔ بڑی سادگی سے تیار ہوئی۔
پاپا کی گاڑی میں امی۔ سنبل ارسلان اور چچی جان اس کے ہمراہ تھیں۔ چچا کی گاڑی میں
سمعیہ، ربیعہ، ربنا، بینا وغیرہ تھیں۔

گاڑی پیچھے ہی گیٹ میں داخل ہوئی۔ لان میں کھیلتا ہوا گڈو بھاگ کر آگیا۔ اور خوشی سے
اس سے لپٹ گیا۔
"امی میں نے ابو سے اتنا کہا کہ آپ کو لے آئیں۔ مگر وہ نہیں مانے میری ان سے کٹی ہے
آپ بھی مت بولئے گا ٹھیک ہے نا۔"
اس نے سر اٹھا کر گڈو کو دیکھا۔ اور جھک کر گڈو کا ماتھا چوم لیا۔
بوا کے ہمراہ دارا شکوہ پورچ میں آئے۔
"ابو دیکھیے۔ امی خود آگئی ہیں، اب میں امی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔" اس نے باپ کو
بتانے والے انداز میں کہا۔
چچا اور پاپا سے دارا شکوہ نے بغل گیر ہو کر عید ملی اور سب کو لئے ہوئے گھر کے اندر چلے
آئے۔ وہ ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے بوا کے ساتھ کچن میں چلی آئی۔ اور چائے کی
تیاری میں لگ گئی۔ اہتمام سے ٹرالی سجا کر بھجوا دی۔ خود ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔
بوا واپس آئیں تو وہ ان کے ساتھ کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ شاہدہ سو رہی تھی۔ بوا
اسے جگا کر آئی تھیں۔ وہ افتاں و خیزاں بھاگی چلی آئی۔ اور اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔
"بھابی۔ تم بتاؤ کیوں چلی گئی تھیں۔ ہم سب کتنا پریشان ہوئے تھے۔"
تب وہ اس سے علیحدہ ہو گئی۔
"شاہدہ! اب تو میں آگئی ہوں نا۔ مت روؤ میں نے بھلا کہاں جانا تھا۔"
اس نے افسردگی سے کہا اور بوا کے ساتھ کام میں لگ گئی۔ تینوں نے مل کر کھانا تیار کیا۔
اسی دم اطلاع آئی سیما عطا بھائی کے ساتھ آئی ہے۔ وہ اس کے استقبال کو بڑھی ہی تھی کہ
سیما کچن ہی میں چلی آئی۔
"کیا ڈرامہ ہے بھئی، اور تم عین عید کے دن محرمی صورت کیوں ہو۔ اس حلیے میں تم
اپنے میاں سے عید ملی ہو۔؟ پہلی عید ہے تمہاری شادی کے بعد۔! چلو جا کر اچھی طرح تیار
ہو۔ شاباش آؤ میرے ساتھ۔"
سیما نے اس کے لئے خوبصورت سی ساڑھی کا انتخاب کیا وہ مزید اہتمام سے انکار کرنے
لگی۔
"میرا دل نہیں چاہتا سیما۔"

"پاگل ہو تم تو۔ تمہیں تو آج خوش ہونا چاہیے کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔"

"ضروری ہے کہ ایسا ہی ہوتا اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا میرا۔؟" اس کی آواز بھر آگئی۔ اور وہ تیزی سے بیڈ روم سے باہر آگئی۔

یمانے اور بوا نے کھانا لگا کر سب کو اطلاع دی' سب مسکراتے چہروں کے ساتھ کھانے کے کمرے میں چلے آئے' وہ میز پر نیپکن رکھ رہی تھی۔ شور پر اس نے سر اٹھایا دارا شکوہ سر کے ساتھ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کو ان کی نظریں ملیں۔ اس نے فوراً" نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

سب لوگ وسیع ٹیبل پر براجمان ہو گئے' وہ گرم گرم چپاتیاں لا کر رکھنے لگی۔

"تم کیا ہمارے نوالے گنو گی۔؟ آؤ۔ میرے پاس آجاؤ۔" یمانے اسے کھویا کھویا سا محسوس کر کے شگفتگی سے کہا۔

"نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ باہر نکل گئی۔ امی نے گھر میں اس کی بے تکلفی دیکھی' اس کی مصروفیت دیکھی اور۔۔ دل ہی دل میں اسے دعائیں دے ڈالیں۔ کھانا کھا کر کافی کا دور چلا۔ سب کے ہنسنے بولنے کی آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔ وہ خاموشی سے کچن میں خواہ مخواہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

رات گیارہ بجے کے قریب سب لوگ گئے۔ تین کاریں آگے پیچھے باہر نکلیں۔ وہ گیٹ پر دارا شکوہ کے ہمراہ مسکرا کر الوداع کہہ رہی تھی۔

جب وہ اندر آنے لگے تو وہ جان بوجھ کر آہستہ چل رہی تھی۔ دارا شکوہ بھی آہستہ ہو گئے۔

"عید مبارک ہو۔" نیوی بلیو شلوار سوٹ میں ان کا سراپا شاندار شخصیت کا غماز تھا۔ وہ اس کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ ہلکی مہک ان کے وجود سے اٹھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے کومل کامیابی پر خوشی نہیں ہوئی تمہیں؟" انہوں نے اس کے سادہ سے مکھڑے کو محبت سے دیکھا۔ وہ قطعی خاموش رہی یہاں تک کہ بیڈ روم کا دروازہ آگیا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ دارا شکوہ اس کے پیچھے داخل ہو گئے۔

"مجھے پتا ہے کومل تم سخت ناراض ہو۔ لیکن مجھے تم پر اعتماد تھا کومل کہ تم اصل جانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ لیکن۔"

"صاحب... پروفیسر صاحب! میں تو اپنے کیے پر نادم ہوں اگر میری شادی پسند کی نہ ہوئی اور نہیں ... ایسا ہوتا تو میں پانی میں ڈوب کر مرنا پسند کرتی۔ مگر دوبارہ کبھی اس کے گھر کا شوہر کا ... دیکھتی۔ مگر میری ضد کم فہمی کا نتیجہ نکلی واقعی انسان کو اپنی عقل پر اتنا بھروسہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنے آپ سے شرمندہ ہوں۔ اپنے غلط فیصلے پر نادم ہوں۔ اپنی کم عقلی پر شرمسار ہوں۔" اس کی آواز بھر آگئی۔ "میں صرف اس لئے چلی آئی ہوں۔ اگر نہ آتی تو ساری زندگی ایک ہی طعنہ سنتی کہ ضد میں کسی کا کہنا نہ ماننے کا انجام یہی ہوتا ہے۔ لوگ مجھ سے ہمدردی کرتے بلکہ بار بار جتاتے کہ کم عقلی کا نتیجہ ہے۔ ساری زندگی ماں باپ سے آنکھیں نہ ملا پاتی۔ اب میں آگئی ہوں۔ آپ میرے شوہر ہیں۔ مجھ پر بہت سے حق رکھتے ہیں۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو کوئی شکایت نہ ہو۔ اگر مجھ سے غلطی ہو جائے تو یہ سمجھ کر معاف کر دیا کریں کہ مجھے صحیح اور غلط کی تمیز نہیں ہے۔"

آنسو روانی سے اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ تیزی سے ملحقہ ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے چلی گئی۔ واپس آئی تو دارا شکوہ کروٹ بدلے بیڈ پر دراز تھے۔ گہری سوچوں میں گم نیلگوں مدھم سی روشنی میں بلیو نائٹی پہنے ہاری ہوئی لگ رہی تھی۔

خاموشی سے وہ ان سے کافی فاصلہ پر دراز ہو گئی۔

وہ بازو آنکھوں پر رکھے قطعی گم سم تھی۔

معاً" دارا شکوہ نے اس کا دودھیا بازو اس کی آنکھوں سے ہٹایا۔

"زندگی۔ اکوشش میری زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا مجھے ہر چیز میں کمال کی تلاش رہتی ہے۔ خوشی میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

میں مکمل خوشی چاہتا تھا۔ کومل! یہ بھی کوئی خوشی ہوتی ہے کہ آدھے لوگ غمزدہ ہوں اور
خوشیوں میں گم۔ کومل تمہاری ذات سے وابستہ ہر شخص مجھے عزیز ہے۔ میں نے تم سے کہا
تھا کہ میں قائل کرنے کی کوشش کرنا۔ مگر تم نے گھائل کر دیا تھا۔ ان کو ضد اور
ہتھیاروں سے۔ کومل! ماں اور باپ زندگی میں ایک بار ملتے ہیں۔ کومل۔ ہر چند کہ میں
تمہارے لئے بڑی خوشی تھی۔ لیکن تم کب تک اپنے گھر والوں کو یاد نہ کرتیں۔ کومل۔ تم
نے مجھے خودغرض کہا تھا۔ کومل! میں خودغرض نہیں ہوں۔ تم سے دوری کا کرب اسی لئے
برداشت کیا تھا کہ خودغرضی کا طعنہ نہ ملے۔ پاپا اور ممی ساری زندگی مجھے کوسا کرتے اور
کومل۔ تم بھی محبت آمیز قربتوں میں مجھ سے انصاف نہ کرپاتیں۔

کومل۔ میں نے تم سے مکمل شدید محبت پانے کی آرزو کی ہے۔ ادھورا پن نا برداشت
نہیں۔ ماں، باپ، بہن بھائی، ایک ٹھوس حقیقت ہیں۔ ہم انہیں دل سے نہیں کھرچ سکتے۔
تم مجھ سے محبت کرتیں اس گھر سے محبت کرتیں یا اپنے باطن۔ اپنے ضمیر سے جنگ کرتیں۔
کومل! محض تنہا محبت و قربت تمہیں کب تک خوش رکھتی۔ جان! دنیا میں ہمیں جو محبت بھی
ملتی ہے اپنی جگہ اہم ہوتی ہے۔

کومل۔ میرا تو ایک فلسفہ ہے کہ جن سے محبت کی جاتی ہے ان کو دکھ نہیں دیئے جاتے۔

اگر پاپا۔ امی ہم سے ناراض رہتے تو کومل تمہارے لئے یہ بندھن شادی نہیں۔ عزیز
باشقت ثابت ہوتا۔ میں اتنی حساس لڑکی کو عمر بھر کے دکھ کیوں دیتا۔؟ مجھ پر تو تمہاری
محبتوں کے عظیم احسان ہیں میں تمہاری ایک پل کی آزردگی برداشت نہ کرپاؤں گا۔"

"اگر پاپا نہ مانتے تو میرا انجام کس قدر بخیر ہوتا ہے۔ خوب اندازہ ہوگا آپ کو۔"

داراشکوہ نے اس کی رخ اپنی جانب کیا۔

"تو پھر تمہیں لے آتا، مقدر سے اپنی شکست تسلیم کرلیتا۔ مگر میں نے کہا نا مجھے کوشش
کرنے کی عادت ہے۔ میں معجزوں کے انتظار میں نہیں رہتا۔"

"اور وہ جو آپ نے کہا تھا میں ضد سے پاپا کو نہ مناؤں بلکہ لگاتار محنت کروں۔ تب بھی اگر
وہ نہ مانتے۔" اس کے لہجے میں خفگی کا عنصر ابھی تک تھا۔

داراشکوہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آہستگی سے گویا ہوئے۔

"کومل ایک شخص دنیا میں سالم اعضاء کے ہمراہ آتا ہے۔ کسی حادثے میں ٹانگ یا ہاتھ
سے محروم ہو جاتا ہے۔ کومل وہ بھی جیتا ہے۔ ایک شخص جو حسن میں لاثانی ہوتا ہے وہ جی لیتا
ہے۔ ہم بھی جی لیتے۔ مگر حادثوں کے ستائے ہوئے افراد کی طرح۔ محروم اور نامکمل۔ کومل۔
ہم سب محض اپنے لئے نہیں ہوتے۔ آدمی جتنا حقیقت پسند ہوتا ہے زندگی اتنی آسان ہوتی
ہے۔ خواب دکھ دیتے ہیں کومل۔"

ان کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کررہی تھیں۔

کومل نے نظریں اٹھا کر اپنے روم روم سے محبت کرنے والے شخص کو دیکھا۔

"خواب دکھ دیتے ہیں تو محبت بھی خواب ہے۔" کومل نے دوبارہ کروٹ بدل لی۔

"نہیں کومل محبت ہمارے شعور اور لاشعور دونوں کا تقاضا ہے۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت
ہے۔ خواب نہیں ہے۔ البتہ ایک غم مسلسل ضرور ہے۔ یہ پل صراط کا سفر ہے مگر آدمی نہ
تھکتا ہے نہ گرتا ہے۔ اس سفر میں۔"

معاً کومل نے کروٹ بدل کر ان کی سمت دیکھا۔ "آپ نے تو اتنے دن فون تک بھی نہیں
کیا تھا۔"

وہ وارفتگی سے مسکرائے۔ "مجھے اپنی چاہت کی استقامت پر یقین ہے۔ میں محنتی آدمی
ہوں۔ محبت میں بھی محنت کا قائل ہوں کیا معلوم تم کسی بات سے میری استقامت میں دراڑ
ڈال دیتیں۔"

"بائرن کہتا ہے عورت پہلے جذبے میں اپنے چاہنے والے کو چاہتی ہے۔ بعد میں اسے

تمام جذبوں کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے۔" اس نے پہلی مرتبہ ان کی سمت بغور دیکھ کر مزید گویا ہوئی۔

"عمل آپ کی جانب سے شروع ہوا تھا۔ اس لحاظ سے تو۔"

"اب اتنے اعتراف بھی نہ کراؤ۔ ویسے مجھے تمہاری اس آخری بات سے اتفاق نہیں۔"

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ مگر دلوں کے آنگن میں گھنگھرو بج رہے تھے۔

□□□